Regd. L. No.7243

Phone: [redacted]

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

اکتوبر 1979

اس پرچہ میں :-

میں نے کوئی جماعت کیوں نہیں بنائی ؟

میں نماز کیسے پڑھتا ہوں ؟

شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر ——— ۸۸۰۸۰۰	بدلِ اشتراک
۳	خط و کتابت	سالانہ
تین روپے	ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۲ ۔ لاہور	پاکستان ۔ ۳۶/- روپے غیر ممالک ۔ ۲/- پونڈ

جلد ۳۲ — اکتوبر ۱۹۷۹ء — شمارہ ۱۰

فہرست

۱۔ وہ مردِ درویش ! (علیہ الرحمۃ) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲
۲۔ لمعات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳
۳۔ ووٹ کس کو دیا جائے ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۷
۴۔ قرآنی درس کے اعلانات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸
۵۔ باب المراسلات (۱) ہم نے جماعت کیوں نہیں بنائی ۔ (۲) میں نماز کیسے پڑھتا ہوں ۔ (پرویز) ۔ ۔ ۔ ۔ ۹
۶۔ حقائق و عبر ۔ (۱) کتاب الحیل ..... (۲) ایک مبارک اقدام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۲
۷۔ عُشر کے بارے میں فقہی اختلافات ۔ ۔ ۔ ۔ (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۶
۸۔ ہماری تباہی کی داستانِ خونچکاں ۔ ۔ ۔ ۔ (محترم پرویز صاحب) ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۳
۹۔ مجرموں کو شرعی سزائیں کیوں نہیں دی جاتیں ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۱

ایڈیٹر محمد طفیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ پرنٹر شیخ نہا ناحمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ، ۱۰ ہسپتال روڈ لاہور

وہ مردِ درویش! (علیہ الرحمۃ)

آج (۵ ستمبر کی صبح کے) اخبارات میں یہ خبر دیکھ کر کہ گزشتہ روز مولانا غلام مرشد کا انتقال ہو گیا، کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ۳/۴ ستمبر کی درمیانی شب ان کا انتقال ہوا اور ۴ کی صبح ان کی میت ان کے آبائی گاؤں واقع ضلع سرگودھا لے جائی گئی لیکن نہ تو ریڈیو نے ایسے عظیم ملی حادثہ کو درخورِ اعتنا سمجھا اور نہ ہی ٹی وی نے اس قابل کہ اسے نشر کیا جائے۔ اگر وقت پر اطلاع مل جاتی تو کم از کم ان کے جنازے کے ساتھ چار قدم چلنے کی سعادت تو حاصل ہو جاتی۔ مجھے اس محرومی کا افسوس ہی نہیں صدمہ عمر بھر رہے گا۔

علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے بعد مولانا غلام مرشدؒ جیسا جید عالمِ قرآن میری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ جس دھڑلے اور دبدبے، جرأت اور بیباکی سے قرآن کی آواز بلند کرتے تھے اس کی مثال کم ملے گی۔ حق بات کہنے میں کسی قسم کی مصلحت یا مداہنت ان کے گلوگیر نہیں ہوتی تھی۔ وہ اقبالؒ کے الفاظ میں —— رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن —— کی زندہ تصویر تھے۔ صرف ایک مثال پر غور فرمایئے۔ شاہی مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر، عید الاضحیٰ کے خطبہ میں، لاکھوں کے مجمع میں اپنی مخصوص گرجدار آواز میں یہ اعلان کرنا کہ جو قربانیاں قریہ قریہ گلی گلی کوچہ کوچہ دی جاتی ہیں ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں (او کما قال) جس جرأت اور بے باکی کا متقاضی تھا، اس کا اندازہ اس مخالفت کے طوفان سے لگ سکتا ہے جو اس پر برپا کیا گیا تھا۔ لیکن اس سے بھی ان کے پائے استقامت میں لغزش تو کیا، لرزش تک بھی نہیں آنے پائی تھی۔ اس ہیچمدان کے ساتھ وہ جس شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے اس کی یاد میرا سرمایۂ حیات ہے۔ میری ہر تحریر کا بڑے شغف اور انہماک سے مطالعہ فرماتے اور اس کے بعد اس قدر رغبت بھرے انداز سے دعائیں دیتے کہ اس سے میری عمر بڑھ جاتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر کہیں کوئی بھول یا سلوٹ نظر آتی تو پھر بخشتے بھی نہیں۔ میں ان کی تحسین سے زیادہ ان کی تنبیہ کا منتظر رہتا کہ اس قسم کی مشفقانہ تنقیح کا کسی اور گوشے سے امکان ہی نہیں تھا۔ قرآن کے خلاف کوئی بات ان کے علم میں آتی تو علی الصبح ٹیلیفون پر جانی پہچانی گرجدار آواز آتی جس میں اپنے دیس کی بولی میں فرماتے —— "او بھرا! قرآن تے یلغار ہو رہی اے، تے توں سُتّا پیا ایں" (او بھائی! قرآن پر یلغار ہو رہی ہے اور تم سوئے پڑے ہو)۔ اس کے بعد بتلاتے کہ کس نے قرآن کے خلاف کیا کہا ہے اور اس کا جواب دینا کس قدر ضروری ہے۔ ٹیلیفون بند کرتے تو ہمیشہ ان الفاظ کے ساتھ کہ دعا کرنا کہ مرتے وقت میری زبان پر "قل اللہ" کے الفاظ ہوں"۔

کہنے کو تو بہت کچھ باقی ہے لیکن اس مختصر سی گنجائش پر اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق
اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

تو میرے خیال میں ان کے پیش نظر یہی "مردِ بزرگ" تھے۔

کس قدر قابلِ رشک ہے وہ زندگی جو خدمتِ القرآن میں گزرے اور کس قدر حسین ہے وہ موت جو یہ کہتے ہوئے آئے کہ "قال اللہ تعالیٰ" یہ حضرات اصحاب الیمین میں سے ہوتے ہیں جن کا ملائکہ جنت یہ کہہ کر استقبال کرتے ہیں کہ سَلٰمٌ عَلَیْکُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۳۲)۔ اللہ کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں قرآن کے اس فدائی پر۔

محرومِ رفاقت پرویز

مولانا مرحوم کو قرآن کے ساتھ کس قدر گہرا عشق، تحریک پاکستان کے ساتھ کس قدر والہانہ شیفتگی اور قائداعظمؒ کے ساتھ کس قدر مخلصانہ تعلق تھا، اس کی شہادت ان کے اس مقالہ سے ملے گی جو آج سے تین سال قبل زینتِ طلوع اسلام ہوا تھا۔ اسے ہم ان کی یاد میں طلوع اسلام کی آئندہ اشاعت میں شائع کریں گے۔ طلوع اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(مرقومہ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۹ء)

طلوعِ اسلام کی زیرِ نظر اشاعت میں چند صفحات آگے چل کر آپ کے سامنے پرویزؔ صاحب کا وہ خطاب آئے گا جسے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں پیش کیا تھا۔ یہ درحقیقت داستان تھی اُن ریشہ دوانیوں اور تخریب کاریوں کی جو مملکتِ پاکستان کے خلاف اس کے یومِ تشکیل سے مسلسل بروئے کار لائی جاتی رہیں۔ ۱۹۷۵ء کے بعد اس وقت تک کیا ہوا اس کے متعلق یوں سمجھئے کہ ایک آتش گیر مادہ تھا جو مسلسل جمع کیا گیا اور اس کے بعد اس میں ایک چنگاری پھینک دی گئی جس کے شعلے اب اس مملکت کو محیط ہیں۔ یہ کچھ محض اتفاقیہ ظہور میں نہیں آگیا۔ یہ سب کچھ ایک طے شدہ اسکیم کے مطابق وجود میں لایا گیا جب ہندوؤں کی سرتوڑ کوشش کے علی الرغم تقسیمِ ہند کا فیصلہ ہو گیا تو انہوں نے اپنا محاذ بدلا اور یہ فیصلہ کیا کہ اس ملک کے اندر ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن سے یہ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جائے۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو ایک طرف تقسیمِ ہند کی دستاویز پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

(مرحوم) مشرقی پاکستان کے اندر ایسے حالات پیدا کرنے میں ہندوؤں کے لئے کوئی دشواری نہیں تھی۔ وہاں قریب ڈیڑھ کروڑ ہندو تھے جن سے کہہ دیا گیا کہ وہ وہیں رہیں۔ وہ صرف تعداد ہی میں اتنے کثیر نہیں تھے۔ ان کی حیثیت بھی ایسی مؤثر تھی کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے تھے۔ مغربی پاکستان میں یہ کیفیت نہیں تھی۔ اس لئے یہاں تخریبی حالات پیدا کرنے کے لئے ہندوستان سے تخریب کار عناصر کو یہاں بھیجنا ضروری تھا۔ ہندوؤں کی دوررس نگاہ نے بھانپ لیا تھا کہ یہاں کے عوام پر مذہب کی گرفت بڑی مضبوط ہے اس لئے یہاں وہ حالات جن کی طرف پنڈت نہرو نے اشارہ کیا تھا مذہب کے نقاب ہی میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضرورت تھی ایسی مذہبی جماعتوں کی جو تشکیلِ پاکستان کی دل سے مخالف ہوں۔ ان جماعتوں میں پیش پیش جمعیت العلماء ہند اور جماعت اسلامی تھیں۔ انہوں نے منظم اور مسلسل انداز سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ جمعیت العلماء ہند سے وابستگان جس کے اُس زمانے کے سربراہ مفتی محمود کے پیر و مرشد اور استاد مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے، کھلے بندوں کانگریس کے ساتھ تھے۔ انہیں کہا ہی کانگریسی علماء جاتا تھا۔ اس لئے ان پر ہندوؤں کو پورا پورا اعتماد تھا۔ جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے انہوں نے سات سال تک تحریکِ پاکستان کی ناکام

مخالفت کے بعد اپریل ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں میں جا کر انہیں ورغلانا شروع کیا تھا کہ تشکیل پاکستان کے بعد تم پر جو یہاں قیامت ٹوٹے گی اس سے محفوظ رہنے کی اب ایک ہی صورت ہے کہ تم تقسیم ہند کی مخالفت کرو۔ اس سلسلے میں ان کا جو اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا تھا اس میں خود مہاتما گاندھی نے شریک ہو کر اطمینان اور مسرت کا اظہار کیا تھا (ملاحظہ ہو روئداد جماعت اسلامی حصہ پنجم صفحہ ۱۷۱)۔ جمعیت العلماء ہند سے مفتی محمود یہاں کے رہنے والے تھے اور دیوبندی علماء کچھ تو پہلے ہی یہاں پھیلے ہوئے تھے اور کچھ بعد میں آگئے اور انہوں نے مساجد اور مکاتب سنبھال لئے۔ جماعت اسلامی کا مسکن ضلع گورداسپور کی بعید ترین تحصیل پٹھان کوٹ میں واقع تھا جو ہندوؤں کا گڑھ تھی۔ وہاں سے یہ جماعت نہایت امن و امان سے پاکستان پہنچ گئی۔ حالانکہ اس ضلع کے ان علاقوں کے مسلمان بھی جہاں ان کی اکثریت تھی، بری طرح لٹے پٹے اور قتل ہوئے تھے۔ ہم کسی کے خلاف بہتان نہیں تراشا کرتے لیکن قرائن کی بعض شہادات ایسی ہوتی ہیں جن کی بناء پر انسان بآسانی کسی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ ہندوستان میں مودودی صاحب کی کوئی نمایاں حیثیت نہیں تھی نہ ہی جماعت اسلامی کوئی اہم سیاسی مقام کی مالک تھی۔ یہاں پہنچنے پر انہوں نے جو پہلا بیان دیا اس میں تقسیم ہند کی روئداد بیان کرنے کے بعد کہا تھا کہ

> یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے ..... یہ ساری جماعت بازی گروں سے بھری پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔
> (ترجمان القرآن۔ جون و اگست ۱۹۴۸ء)

یہ کون لوگ تھے جن کا منہ کالا کر کے ان کی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دنیا کو دکھایا جا رہا تھا؟ ان میں سرفہرست مملکت پاکستان کا گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناحؒ اور اس کے بعد حکومت پاکستان کے جملہ اعیان و ارکان شامل تھے۔ آپ سوچئے کہ ایک شخص جو بے گھر اور بے در، اس ملک میں پناہ لینے آیا ہو، اس کے گورنر جنرل اور ارباب حکومت کے خلاف ایسا کچھ بے باکانہ کہنے کی از خود جرأت کر سکتا تھا؟ ایسا قطعاً ناممکن تھا جب تک اس کے پیچھے کوئی بہت بڑی مضبوط طاقت نہ ہوتی جس کے بل بوتے پر وہ ایسا کہنے کی جرأت کر سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جلسے کئے اور ان میں یہی زہر پھیلاتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ ان دوروں اور جلسے جلوسوں کے لئے کافی اخراجات درکار تھے۔ سوال یہ ہے کہ ان کے پاس یہ روپیہ کہاں سے آیا۔ یہ تو کسی صورت باور نہیں کیا جا سکتا کہ قیام پاکستان کے فوری بعد یہاں ایسے ایسے سرمایہ دار موجود تھے جنہوں نے تخریب پاکستان کے لئے اس قدر سرمایہ اس جماعت کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر یہ روپیہ کہاں سے آیا تھا؟ تقسیم ہند کے مطالبہ کے خلاف وہ اس قسم کی دلیلیں دیا کرتے تھے کہ[1]

> یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے ..... اگر یہ لوگ تحریک پاکستان کے بجائے میری دعوت کو قبول کر لیتے تو دو چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے۔
> (روئداد جماعت اسلامی حصہ پنجم۔ صفحہ ۶۵، ۱۲۰)

ایک طرف عوام کے دل میں یہ خلش پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ تقسیم ہند کی تجویز اور مطالبہ مسلمانوں اور خود اسلام کے خلاف

[1] اس ضمن میں دیکھئے "اضافہ" صفحہ ۲۵

تھا اور دوسری طرف ان کے دل میں یہ زہر بھرتے چلے گئے کہ ان لوگوں نے جو دعوے کیا تھا کہ اس خطۂ زمین کو اس لئے حاصل کیا گیا ہے کہ اسے اسلامی مملکت بنایا جائے، دھوکہ فریب تھا، فراڈ تھا۔ ان کے اپنے الفاظ میں :-

یہاں معاملہ یہ ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے بڑی کوششیں کی گئیں اور یہ حاصل اس لئے کیا گیا کہ ہم یہاں اسلامی قوانین نافذ کریں گے۔ پاکستان کا مطلب لاالٰہ الا اللہ بیان کیا گیا۔ لاکھوں آدمیوں کی جانیں کٹوا دی گئیں۔ لاکھوں آدمیوں کی عزتیں گنوا دی گئیں اور لاکھوں کی جائدادیں تباہ کروا دیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب ملک حاصل ہوا تو اس کام کو چھوڑ دیا گیا جس کے لئے ملک حاصل کیا گیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑا فراڈ دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا جو کیا گیا اور اس سے زیادہ دھوکہ بازی کوئی نہیں ہو سکتی کہ ملک حاصل کرتے وقت تو نام اسلام کا لیا جائے مگر پھر ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام کو نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا۔

(ایشیا مؤرخہ ۹ رمئی سنہ ۱۹۷۱ء)

اس سے لازماً یہ سوال سامنے آنا تھا کہ اس مملکت کو اسلامی بنانے کے لئے کیا کیا جائے؟ انہوں نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا :-

میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔ (ایشیا ۹ رمئی سنہ ۱۹۷۱ء)

یہاں سے بات نکھر کر سامنے آ گئی۔ علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیتے وقت اور قائد اعظمؒ نے پاکستان کی تشکیل کے وقت یہ کہا تھا کہ اس مملکت کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھیاکریسی ہے اور ہم یہاں تھیاکریسی قائم نہیں ہونے دیں گے۔ مودودی صاحب نے قریب تیس سال کی مسلسل اسکیموں اور سازشوں کے بعد بالآخر اس کا اعلان کر دیا کہ یہاں تھیوکریسی قائم کی جائے۔ اس مقصد کے لئے مذہب پرست جماعتوں نے ایک متحدہ محاذ قائم کیا۔ ان جماعتوں کے باہمی اختلافات کی شدت کا یہ عالم تھا کہ مفتی محمود صاحب نے اعلانیہ مودودی صاحب کے خلاف یہ فتویٰ صادر کیا تھا کہ وہ کافر دائرۂ اسلام سے خارج اور امریکہ کے ایجنٹ ہیں۔ مفتی صاحب اور نورانی صاحب کے باہمی اختلاف کی یہ کیفیت تھی کہ اس اتحاد کے دوران بھی وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک نہیں پڑھتے تھے۔ ان میں قدرِ مشترک صرف ایک تھی یعنی قائد اعظمؒ کے خلاف بغض اور عداوت اور پاکستان کی مخالفت۔ اس مشترکہ مقصد کے ساتھ ایک محاذ قائم کیا گیا اور عوام سے کہا یہ گیا کہ اس کا مقصد نظامِ مصطفیٰؐ کا قیام ہے۔ آپ سوچئے کہ جو لوگ ایک دوسرے کو کافر کہیں اور نماز تک میں متحد نہ ہو سکیں کیا وہ نظامِ مصطفیٰؐ قائم کر سکتے تھے! اس تحریک سے مقصد یہ تھا کہ بالفور مودودی صاحب کی منشا کے مطابق براہِ راست اقتدار حاصل کر لیا جائے اور اگر حسبِ اوّل میں ایسا ممکن نہ ہو تو جو بھی حکومت قائم ہو اس کے دل میں اپنی دھاک بٹھا کر یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ اس ملک میں مذہبی پیشوائیت کی تائید اور حمایت کے بغیر کوئی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ اس طرح بالواسطہ اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ حضرات اس مقصد میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے مسلسل پراپیگنڈے کے زور پر "شرعی قوانین" کے نفاذ کی طرح ڈال دی۔ اس کی قسطِ اوّل چند شرعی حدود کی شکل میں نافذ ہو چکی ہے اور اس کے بعد کے اقدامات زیرِ غور ہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ تھیاکریسی ہی کی ایک شکل ہے۔ تھیاکریسی کے معنی ہوتے ہیں مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ قوانین کو مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کرنا اور انہیں "خدا اور رسول کے قوانین" کہہ کر ان کی اطاعت کرانا۔ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ نے تھیاکریسی کو مملکت کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا تھا۔ تھیاکریسی کی اس ابجد سے پاکستان میں جو خطرات ابھر کر سامنے آ رہے ہیں

ان سے اس خطرہ کی نمایاں شہادت مل رہی ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ دیکھئے کہ شرعی سزاؤں کے سلسلے میں شیعہ و سنی حضرات اپنی اپنی فقہ کو اسلامی تصور کرتے تھے لیکن ان کے اختلافات مناظروں اور مباحثوں سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ لیکن جب ان مسائل کو مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کر دیا گیا تو ان کے باہمی اختلافات نظری اور بحثی نہ رہے۔ چنانچہ شیعہ حضرات نے اعلانیہ کہہ دیا ہے کہ اگر ہمیں ان قوانین کی اطاعت پر مجبور کیا گیا تو ہم کوئی دوسری راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ آپ سوچئے کہ تھیاکریسی کے اس قدمِ اوّل سے مملکت کی بنیادوں میں کس قسم کے تزلزل کے خطرات نمودار ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا گوشہ بھی سامنے لائیے۔ شرعی حدود سے متعلق قوانین ۱۰ فروری کو نافذ ہوئے اور اس کے دو ہی دن بعد خود صدرِ مملکت نے کہہ دیا کہ یہ ناقابل العمل ہیں۔ لیکن مذہبی پیشوائیت نے اپنی سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق اسے پروپیگنڈے کا حربہ بنا لیا۔ یعنی پہلے تو یہ حضرات کہتے تھے کہ یہاں کے اربابِ حکومت فریب کار ہیں جو اسلامی قوانین نافذ کرنا نہیں چاہتے۔ اور اب کہتے ہیں کہ موجودہ حکومت نے قوانین تو نافذ کر دیئے ہیں لیکن یہ ان پر عمل نہیں کرا رہی۔ یہ پروپیگنڈہ عوام میں پھیلایا جا رہا ہے۔ جہاں تک ہماری نئی نسل کا تعلق ہے وہ اعلانیہ کہہ رہے ہیں کہ اگر یہی وہ اسلام تھا جس کے لئے پاکستان قائم کیا گیا تھا تو اس سے سیکولر نظام ہزار درجہ بہتر تھا۔

آپ سوچئے کہ کیا ہماری ان مذہبی جماعتوں نے یہاں وہ حالات پیدا نہیں کر دیئے جن کی طرف پنڈت جواہر لال نہرو نے تقسیمِ ہند کی دستاویز پر دستخط کرتے وقت اشارہ کیا تھا! کیا اس سے اس قیاس کی تائید نہیں ہوتی کہ یہ حضرات یہاں آئے ہی اس غرض کیلئے تھے؟

یہ حضرات اپنی اس کامیابی پر خوش تو ضرور ہوں گے لیکن بد فطرت کی نگاہوں کو نہیں دیکھ سکتے جو ان کی اس خود فریبی پر مسکرا رہی ہے۔ تخریب سازی کی تلوار دو دھاری ہوتی ہے۔ اگر یہ اپنے مخالف کو مضروب کرتی ہے تو پلٹ کر اس سے کہیں زیادہ زخم خود تلوار چلانے والے کو بھی لگاتی ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ تخریبی تدابیر پلٹ کر ان تدابیر کرنے والوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہیں۔ تو اس سے یہی مراد ہے۔ یہ حضرات جسے اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں وہ درحقیقت ان کی سب سے بڑی ناکامی ہے۔ جب تک انہوں نے اپنے آپ کو خالص مذہبی دائروں تک محدود رکھا لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت اور احترام تھا۔ لوگ ان کے پاؤں بھی چومتے تھے اور نذرانے بھی پیش کرتے تھے لیکن ہوسِ اقتدار کی مدہوشیوں سے ان سے جو حرکات سرزد ہوئی ہیں ان سے یہ بالکل برہنہ ہو کر لوگوں کے سامنے آ گئے ہیں۔ کیا یہ حقیقت عبرت انگیز اور فطرت کا انتقام نہیں کہ آج ملک میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت یہی طبقہ ہے۔ یہ تو ابھی قدمِ اوّل ہے۔ تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ تھیاکریسی کا انجام یہ ہوتا ہے کہ مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ یورپ، روس، چین کا سیکولر نظام تھیاکریسی کے ردِ عمل ہی کا پیدا کردہ ہے۔ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت نے سیکولر نظام کے لئے زمین ہموار کر دی ہے لیکن انہیں اپنی اس کامیابی پر خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ سیکولر نظام میں مذہب جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں دیکھئے۔ وہ قوم مذہب میں گلے گلے تک ڈوبی ہوئی تھی اور برہمن کے اشلوکوں کے بغیر وہ لقمہ تک اٹھا نہیں سکتے تھے۔ چند سالوں کے سیکولر نظام سے نہ وہ اشلوک باقی رہے نہ اشلوک پڑھنے والے پنڈت۔ جواہر لال نہرو پاکستان میں ایسے ہی حالات پیدا کرنا چاہتا تھا۔ سو وہ اس میں کامیاب ہو گیا اور اسے کامیاب بنانے والوں نے سوچا ہی نہیں کہ اس سے انہیں کس قدر ذلت آمیز شکست ہوئی۔ خدائے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔

یہ صورتِ حالات بظاہر بڑی یاس انگیز ہے لیکن جن کی نگاہیں قرآن پر ہیں وہ نہ صرف یہ کہ ان حالات کی وجہ سے مایوس نہیں بلکہ وہ انہیں قرآنی اقتدار کے لئے بڑا سازگار پاتے ہیں۔ قرآن نے الا اللہ تک پہنچنے کے لئے لا الٰہ کی منزل کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کے خلاف اس قدر عام نفرت اور ان کے پیش کردہ مذہب کے خلاف سرکشی لا الٰہ ہی کے مظاہر ہیں۔ اس کے بعد الا اللہ کے لئے راستہ ہموار ہو جائے گا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں: — مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگیست　باش تا بینی کہ انجامِ تو چیست۔

ووٹ کس کو دیا جائے؟

جوں جوں جنرل انتخابات کا چرچا عام ہوتا جا رہا ہے، ہمیں استفسارات موصول ہو رہے ہیں کہ ووٹ کس کو دیا جائے؟ یہ واضح ہے کہ ہم عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے۔ نہ ہماری اپنی کوئی سیاسی پارٹی ہے۔ نہ ہم کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہوتے ہیں۔ اگر بزمِ طلوعِ اسلام کا کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہونا چاہے تو اسے بزم کی رکنیت سے استعفیٰ دینا پڑتا ہے۔ بزم کا رکن البتہ اپنی ذاتی حیثیت سے آزاد امیدوار کے طور پہ اسمبلی کی رکنیت کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اگر اس اسمبلی میں کوئی مسئلہ ایسا سامنے آئے گا جو قرآن مجید کے خلاف ہوگا تو وہ اس کی مخالفت کرے گا۔

جہاں تک ووٹ دینے کا تعلق ہے قرآنی راہ نمائی کی وضاحت ہمارا فریضہ ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آپ اس شخص کو ووٹ دیں جس کی صداقت، شرافت، امانت، دیانت اور اہلیت پر آپ کو پورا پورا بھروسہ ہو۔ ایسے شخص کے تولنے اور ماپنے کے لئے قرآنِ کریم نے ایک ایسا پیمانہ عطا کر دیا ہے جو کبھی غلطی نہیں کرتا۔ جب نبی اکرمؐ سے آپ کے مخالفین نے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ آپ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶)" میں کوئی اجنبی یا نووارد نہیں۔ میں نے اس سے پہلے اپنی پوری عمر تم میں بسر کی ہے۔ کیا تم اس پر غور کر کے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ اس آیت میں "مِّن قَبْلِهِ" کا ٹکڑا بڑا بنیادی ہے۔ جب کوئی شخص کسی منصب کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اپنی وضع بڑی مقدس بنا لیتا ہے لیکن اس کا صحیح کیریکٹر اس کی اس زمانے کی زندگی سے سامنے آ سکتا ہے جب وہ عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ ہے صحیح پیمانہ۔ جو شخص بطور امیدوار کھڑا ہو آپ یہ دیکھیئے کہ اس کی پہلی زندگی کس قسم کی گزری ہے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ کا وہ معیار بھی شامل کر لیجئے کہ آپ نے کسی شخص سے کہا کہ وہ اپنے دعوے کی تائید کے لئے کسی ایسے آدمی کو لائے جو اعتماد کے قابل ہو۔ اس نے ایک شخص کا نام لیا تو آپ نے اس سے پوچھا:-

کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے —— اس نے کہا، نہیں۔
پھر پوچھا —— کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو —— اس نے کہا نہیں۔
آپ نے پھر پوچھا —— کیا اس کے ساتھ تمہارا کبھی کوئی معاملہ پڑا ہے۔

جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ پھر تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اٹھاتے دیکھ لیا ہوگا اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔ لہٰذا کسی امیدوار کے قابلِ اعتماد ہونے کا فاروقی معیار بھی پیشِ نظر رکھئے۔

آخر میں طلوعِ اسلام کی بزموں کیلئے خاص تاکید۔ گزشتہ تجربہ بتاتا ہے کہ انتخابی سرگرمیوں کے سلسلے میں ملک بحران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آپ کسی ہنگامے میں حصہ نہ لیں۔ مندرجہ بالا معیاروں کے مطابق بہترین امیدواروں کے حق میں ووٹ دیں اور خاموشی اور سکون سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے پروگرام پر حسبِ معمول عمل پیرا رہیں۔ یہ سب ہنگامے رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے اور آخر الامر سربلندی قرآن ہی کے پیغام کو نصیب ہوگی۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ قرآن کے راستے میں حائل ہونے والے موانعات خزاں کے زرد پتوں کی طرح کس طرح ایک ایک کر کے گرتے چلے جا رہے ہیں!

محترم پرویز صاحب کا

درسِ قرآن

لاہور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (فون ۸۸۰۸۰۰)
بی ۲۵/۲ - گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

بزم طلوع اسلام ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے بعد دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
لندن (انگلینڈ)
M9 SUTTON COURT RD
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01-552-1617

کراچی میں ہر جمعہ کو ۹ ۱/۲ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ
بزم طلوع اسلام، کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی ۲

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر
چوہدری شاہنواز صاحب۔ عابد سلک انڈسٹریز
(فون ۳۸۹۰) عقب اڈہ لاریاں (امائی دی جھگی)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان۔ آغا
محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل ڈی آئی جی
مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بازہ روڈ (فون ۴۲۶۵۹)

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ
چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز
(بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خاں۔ نواب علی روڈ

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام
بمقام ۱۲/۱/۱ بی جمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بی ۱۹۶ - لیاقت روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
(فون ۳۱۰۷۱) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔

لیہ میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب۔ رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب۔ سرکلر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقات کار حسب ذیل ہیں
ہر روز علاوہ جمعہ:۔ شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ:۔ صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

نیز کتب خانہ میں ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک کارڈ تحریر کرکے منگوائی بھی جاسکتی ہیں۔

محمد اسلام۔ کتب خانہ بزم طلوع اسلام
کمرہ نمبر ۲۴ - ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ نیو چالی
کراچی ۲

بابُ المراسلات

(میں نے جماعت کیوں نہیں بنائی میں نماز کیسے پڑھتا ہوں)

(پرویز)

◎

قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب کا میرے نام ایک طویل مراسلہ موصول ہوا ہے۔ اس کا جواب تو انہوں نے براہِ راست مانگا ہے لیکن جو سوالات اس میں اٹھائے گئے ہیں ان کا تعلق کسی ایک فرد سے نہیں نفسِ اسلام سے اور اس کے بعد تحریکِ طلوعِ اسلام سے ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ (نام اور مقام کے حوالے حذف کر دینے کے بعد) وہ خط اور اس کا جواب طلوعِ اسلام میں شائع کر دیا جائے۔ مجھے اُمید ہے قارئین اس کے مطالعہ کو مفید پائیں گے۔ پہلے وہ خط ملاحظہ فرمائیے۔

خط

"میں تقریباً ۱۹۷۵ء کے اوائل سے آپ کے ماہنامہ "طلوعِ اسلام" کا مطالعہ کر رہا ہوں .... کے چھوٹے سے قصبے میں قرآنی نظریات کو اپنی حد تک پھیلانے کی کوشش بھی کرتا رہا ہوں۔ آپ سے تعارف میرے دوست ..... نے کرایا۔ آپ کی قرآنی تفسیر پسند آئی۔ گو نہ میں آپ کی کوئی ضخیم کتاب پڑھ سکا ہوں اور نہ ہی "طلوعِ اسلام" کو باقاعدگی سے زیرِ مطالعہ رکھ سکا ہوں لیکن طلوعِ اسلام کی روشنی نے مجھے متاثر ضرور کیا ہے۔ لہٰذا باقاعدگی سے اس کا خریدار ہوں۔

کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے رابطہ قائم کر کے آپ سے اُن سوالات کا جواب حاصل کروں جو میرے اپنے ذہن میں ابھرتے ہیں یا دوسروں کی جانب سے پوچھے جاتے ہیں۔ دیگر حضرات کی قسم مختلف ہے۔ ان میں کچھ متاثرین جماعتِ اسلامی ہیں، کچھ کمیونسٹ۔ سوشلسٹ اور اکثریت دھریوں کی ہے۔ سب سے زیادہ مقابلہ جماعتِ اسلامی سے ہے۔ اکثریت دوستوں کی ہے۔ لیکن اکثر اور ہر وقت کی بحث ..... کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ آپ کی اکثر باتوں خصوصاً معاشی نظام کو پسند کرتے ہیں لیکن کچھ باتیں مولویانہ اور مذہبی سی ہوتی ہیں اور کچھ کا وزن میں خود بھی محسوس کرتا ہوں۔

وجہ یہ ہے کہ میرا مطالعہ ناقص اور نامکمل ہے۔ میں ..... طالب علم (پرائیویٹ) ہوں۔ کافی وقت اُدھر لگتا ہے۔ ملازمت کے دھندے بھی ہیں۔ لیکن خیال آتا ہے کہ زندگی تو انہی دھندوں میں صرف ہو گی کچھ مطالعہ دائمی (ETERNAL) حیثیت و فوائد رکھنے والا بھی کیا جائے۔ لہٰذا جن سوالات کا جواب آپ سے لینا ہے وہ درج کر کے اپنے مطالعہ میں اضافے کے لئے جواب چاہتا ہوں۔ جوابی لفافہ ساتھ ہے۔ کچھ جوابات ذاتی قسم کے ہوں گے۔ اُن کا جواب بھی ضرور عطا فرمائیں کیونکہ آپ کی اپنی ذات بھی خاصی زیرِ بحث رہتی ہے۔ آپ کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے سبب صرف فرضی باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ اطمینان نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو اعتماد سے جواب نہیں دیا جا سکتا۔ صرف خالی دلائل پر بھروسہ کرتا ہوں مگر خود مطمئن نہیں رہتا۔ سب سے بڑا اعتراض ..... یہ کرتے ہیں کہ اسلام میں ایک ایسی جماعت کا قیام ضروری ہے جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔ لیکن پرویز صاحب! اس حکمِ قرآنی کی تعمیل میں ابھی تک کسی باقاعدہ جماعت کا قیام عمل میں

نہیں لائے۔ اُن کا مطلب یہ ہے کہ اس جماعت کو لوگ فرقہ تو ضرور کہیں گے لیکن کم از کم بے چین روحوں (RESTLESS SOULS) کو تو کوئی جائے سکون نظر آسکے گی۔ جماعت نہ ہونے کا مطلب وہ یہ لیتے ہیں کہ پرویز صاحب صرف دوسری جماعتوں

جماعت سازی

پر تنقید ہی تنقید کرتے رہتے ہیں خود کوئی (IDEAL PARTY) پیش نہیں کرتے۔ ایک ایسی جماعت ہونا چاہیئے تھی جو سیاسی، مذہبی یا دینی طور پہ (IDEAL) پیش کرتی تاکہ حکومت الٰہیہ کے قیام کا مقصد حاصل ہو سکتا۔ میں خود بھی یہی سوچتا ہوں کہ فرقہ تو پہلے بھی آپ کے عقائد کو کہا جاتا ہے۔ کیوں نہ ایک جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے جو صحیح قرآنی نظریات پیش کرے اور آہستہ آہستہ اپنا دائرہ وسیع کر کے مخلص اور بے لوث قیادت مہیا کر کے نظامِ الٰہی کے قیام کی جانب قدم اٹھائے۔ مشکلات کا سامنا تو بہر حال کرنا پڑے گا۔ اس مرتبہ اگست کے طلوعِ اسلام میں آپ کے توضیحی مقالہ " بسلسلہ دین و مذہب کی کشمکش" کے آخر پہ آپ نے دبے الفاظ میں اجتماعی کوشش کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس میں مشکلات کے ساتھ ساتھ کامیابی کے امکانات بھی کافی ہیں۔ ایسا راستہ اختیار کرنا جس میں "ہوسِ زر" جیسی میٹھی بیماری کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ دولت محفوظ نہیں رہ سکتی، بہت مشکل اور کٹھن ہے۔ اس میں تو لوگ چندہ دینے سے بھی کترائیں گے۔ عہدوں اور ناموری کا لالچ تنظیم اور جماعت میں رکاوٹ بن جائے گا۔ اور پھر وہاں جہاں سے کسی منافعِ دنیوی کی امید بھی نہ ہو۔ پھر ممکن ہے کہ لوگ تعلیم یافتہ طبقے میں اسے مقبول سمجھ کر ادھر مڑیں اور اسے بھی دوسری جماعتوں کی طرح مختلف حربوں سے بدنام کرنے کی کوشش کریں اور انجام پھر وہی نکلے لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ کام مکمل نہیں ہو سکے گا جسے مکمل ہونا چاہیئے۔ آپ نے لٹریچر کی صورت میں قابلِ تعریف کام خاصی حد تک مکمل کر دیا ہے۔ اب اگلا قدم اجتماعی کوشش ہونا چاہیئے۔

۲۔ جب اجتماعی کوشش کی صورت میں کسی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے گا تو دین کے اہم ترین رُکن "نماز" کے

نماز

بارے میں بھی آپ کو بتانا ہو گا کہ کس طرح مل کر پڑھی جائے۔ آپ کی یقیناً ریسرچ ہو گی کہ حضورؐ پاک اور ان کے صحابہؓ نے کس طرح نماز پڑھی۔ نماز باجماعت کا حکم بھی قرآن مجید میں آیا ہے۔ لیکن آپ قرآنی کنونشن کے موقع پر نماز باجماعت کا اہتمام نہیں کرتے۔ یہ درست ہے کہ بہت سے مختلف عقائد کے لوگ جو آپ سے متاثر ہوں گے ایک دوسرے کے پیچھے قرآنی کنونشن میں بھی نماز پڑھنے سے کتراتے ہوں گے اور آپ کو کہنا چاہیئے کہ وہ اپنے اپنے طریقوں کے مطابق جا کر نماز ادا کر لیں لیکن آپ خود بھی تو کسی نہ کسی طریقے پہ نماز پڑھتے ہوں گے اور یقیناً (جہاں تک میرا اپنا خیال ہے) وہ طریقہ آپ کی تحقیقات کا نچوڑ ہو گا اور میری نظر میں آپ کی ریسرچ موجودہ دور کے دیگر محققین سے زیادہ صائب ہے۔ کیا آپ صرف ان لوگوں سے علیحدہ نماز پڑھنے کا کہتے ہیں جن کی نماز آپ کی نماز (بہ لحاظ ادائیگی وغیرہ) سے نہیں ملتی یا تمام لوگوں سے؟ ــــ آپ نے عبادات کے فلسفے کے علاوہ اُن کی ادائیگی پہ بھی ضرور ریسرچ کی ہو گی۔ کیا آپ نے مختصراً ہی سہی، کوئی ایسی تحریر چھوڑی ہے جس میں عبادات کی ادائیگی کا صحیح ذکر ہو؟ جس میں رسولِ پاک کے طریقہ کا دلیل ثبوت یا درج ہو۔ اور عبادات میں جہاں جہاں تبدیلی کی اجازت ہو۔ وہ بھی درج ہو؟ آخر فلسفہ تو انہی کی سمجھ میں آسکتا ہے جو علمی لحاظ سے بہت اعلیٰ طبقہ ہے۔ ادائیگی سے فوائد تو ہر ایک کو پہنچتے ہیں۔ پھر ادائیگی کا کوئی نہ کوئی طریقہ بھی تو ہو گا۔ ان دو سوالات کے علاوہ مندرجہ ذیل سوالات کا جواب بھی عطا فرمائیں۔ تمام سوالات درج کرتا ہوں جن کے جوابات آپ کی کتب کی صورت میں ہیں۔ کتب کے نام لکھ کر بھیج دیں۔ میں منگوا لوں گا، انشاء اللہ۔ باقیوں کے جواب تحریری

طور پر دے دیں۔ شکریہ۔

سوالات

۱۔ آپ نماز باجماعت کا انتظام کیوں نہیں کرتے؟ آپ خود کون سے طریقے پر نماز پڑھتے ہیں؟

۲۔ آپ نے اب تک کوئی سیاسی یا تبلیغی جماعت کیوں قائم نہیں کی؟ جبکہ قرآن مجید اس کا حکم دیتا ہے۔

۳۔ کیا آپ نے کبھی حج فرمایا؟ ہندوستان کے علاوہ کسی اور ملک کے دورے پر برائے تعلیم یا سیر و تفریح بھی تشریف لے گئے؟

۴۔ اسلام میں خلافت کا معیار اور طریق انتخاب کیا ہے جو قرونِ اولیٰ یا زمانۂ خلفائے راشدین میں اختیار کیا گیا؟ قرآن کیا کہتا ہے اور اب موجودہ دور میں کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟ صحابۂ ثلاثہؓ کا طریق درست تھا؟

۵۔ کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ فقط زیارت کے لئے۔

اگر آپ کے پاس اجتماعی کوشش کا کوئی پروگرام ہے تو اسے نشر فرمائیں، تاکہ کام کچھ آگے بڑھ سکے۔ جس طرح اسلام نے ارتقائی منازل طے کی ہیں اسی طرح احیاءِ اسلام کا بھی اپنی منزل پہ پہنچنا ضروری ہے۔ لٹریچر تیار ہے تو اگلا قدم اٹھایا جائے مگر احتیاط سے، کہیں انجام "مصلحت پسندی" اور پھر جماعتی مفادات کی خاطر قرآن کے مفہوم میں تغیر و تبدل نہ ہو۔ —— انشاء اللہ قرآنی مشعل کو روشن رکھا جائے گا۔ آندھیوں میں بھی اور تاریک راتوں میں بھی۔ حقیقی اسلام غلبہ ضرور حاصل کرے گا مگر ابھی دولت، موجودہ سیاست اور مذہبی پیشوایانہ ذہنیت رکاوٹ ہے۔ اب ان سب کے خلاف نفرت پھیل رہی ہے۔ متبادل حقیقی کی ضرورت ہے۔" والسلام

جواب

اس خط میں بنیادی اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ

> اسلام میں ایک ایسی جماعت کا قیام ضروری ہے جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے لیکن پرویز صاحب اس حکمِ قرآنی کی تعلیم میں ابھی تک کسی باقاعدہ جماعت کا قیام عمل میں نہیں لائے۔

یعنی اتنا ہی نہیں کہ اس قسم کی جماعت کا قیام مناسب یا مفید رہے گا بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور چونکہ میں نے اس حکمِ خداوندی کی تعمیل نہیں کی اس لئے میں معصیتِ خداوندی کے جرم کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ خدا نے امت کے اندر مذہبی فرقے یا جماعتیں بنانے کا حکم تو چھوڑ، اس کی اجازت بھی نہیں دی۔ اس نے اسے بڑی سختی سے روکا ہے اور اسے شرک قرار دیا ہے۔ میں اس موضوع پر کافی کچھ لکھ چکا ہوں لیکن چونکہ مذہبی فرقوں اور جماعتوں کی طرف سے اس گمراہ کن نظریے کی بڑی شد و مد سے اشاعت کی جا رہی ہے (اور اسی وجہ سے مراسلہ نگار بھی اس سے متاثر ہیں) اس لئے ضروری نظر آتا ہے کہ اس باب میں قرآنی احکام اور تعلیم کی ایک بار پھر وضاحت کر دی جائے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ

ان لوگوں کی طرف سے اس قسم کی گمراہ کن مغالطہ آفرینی سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۴ کی تاویل کی آڑ میں کی جاتی ہے۔ اس آیت کے ترجمہ بعد میں پیش کریں گے پہلے یہ دیکھیے کہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" (نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے) کے فریضہ کے متعلق

قرآن کریم کا ارشاد کیا ہے ؟

(۱) اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو مبعوث فرمایا تو حضورؐ کا ایک اہم فریضہ یہ قرار دیا کہ : يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ (۷:۱۵۷) "وہ لوگوں کو معروف کا حکم دے گا اور منکر سے روکے گا"۔ ہم اس مقام پر معروف اور منکر کی تشریح میں نہیں جانا چاہتے۔ اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ جن امور کو قرآن کریم جائز اور درست قرار دیتا ہے۔ وہ معروف ہیں اور جنہیں وہ غلط اور ناجائز ٹھہراتا ہے وہ منکر ہیں۔ رسول اللہ کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔

(۲) لیکن امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا یہ فریضہ تنہا رسولؐ کا نہیں تھا۔ رسولؐ کے ساتھ ایک اُمت کی تشکیل بھی ہوئی تھی اور اس اُمت کا بھی یہی فریضہ قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے کہ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۳:۱۱۰) "تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کی خاطر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے"۔ اس سے واضح ہے کہ یہ فریضہ ساری اُمت کا تھا، نہ کہ اُمت میں سے کسی خاص گروہ کا۔ رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ میں اُمت یہ فریضہ حضورؐ کی سرکردگی میں سرانجام دیتی تھی۔ حضورؐ کی وفات کے بعد اُسے یہ فریضہ تنہا سرانجام دینا تھا۔

(۳) قرآن کریم نے اس کی مزید وضاحت فرما دی کہ یہ فریضہ پوری کی پوری جماعتِ مومنین کا ہے۔ کسی خاص گروہ کا نہیں۔ سورۂ التوبہ میں مومنین کی مختلف خصوصیات بیان کرتے ہوئے انہیں اَلْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ (۹:۱۱۲)۔ کہا گیا ہے۔ یعنی "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والے"۔

(۴) دوسرے مقام پر مومنین کے ساتھ مومنات کا بھی اضافہ کر کے اس کی وضاحت کر دی کہ یہ فریضہ اُمت کے مرد اور عورتیں سب کے سب سرانجام دیں گے۔ ارشادِ خداوندی ہے ؛ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۹:۷۱) "مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں"۔

ان تمام آیات میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں۔ امر کے معنی کسی بات کا حکم دینا ہیں اور نہی کے معنی کسی کام سے حکماً روک دینا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ فریضہ اسی صورت میں سرانجام دیا جا سکتا ہے جب یہ اُمت صاحبِ اقتدار ہو۔ چنانچہ سورۃ الحج میں ہے کہ اَلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ (۲۲:۴۱) "یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض سرانجام دیں گے"۔ اس سے واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ واضح رہے کہ اسلامی مملکت میں اقتدار پوری کی پوری اُمت کو حاصل ہوتا ہے کسی ... کو نہیں (دیکھئے ۲۴:۵۵)۔ لہٰذا اس آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر وعظ ونصیحت کی بات نہیں۔ اس فریضہ کو اسلامی مملکت احکام وقوانین کے ذریعے سرانجام دیتی ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پوری کی پوری امت کا فریضہ ہے نہ کہ کسی خاص گروہ کا۔ اور اُمت اس فریضہ کو اقتدارِ مملکت کی رو سے سرانجام دیتی ہے نہ کہ وعظ ونصیحت کے ذریعے۔ اسلام کے صدرِ اوّل میں اس فریضہ کی ادائیگی کی یہی شکل تھی یعنی اُمت اس فریضہ کو اسلامی مملکت کے ذریعے سرانجام دیتی تھی۔ اس زمانے میں

اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے کوئی الگ گروہ نہیں تھا۔

صدرِ اوّل کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو دین میں ثنویت پیدا ہو گئی جس کے نتیجے میں مذہبی پیشوائیت وجود میں آ گئی۔ انہوں نے کہا کہ سیاسی امور تو حکومت سے متعلق ہیں اور "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" ہمارا فریضہ ہے۔ اس کے لئے انہیں کسی سند کی ضرورت تھی۔ انہوں نے یہ سند تلاش کر لی اور وہ بھی خود قرآن سے۔ آپ حیران ہوں گے کہ قرآن کریم جو مذہبی پیشوائیت کو مٹانے کے لئے آیا تھا، اس سے اس کی سند کیسے مل سکتی تھی! لیکن جب کوئی قرآن کو مسخ کرنے پر اتر آئے تو اسے اس سے اپنی کون سی مصلحت کی سند نہیں مل سکتی؟ سنئے کہ انہوں نے یہ سند کیسے حاصل کی۔

سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت پہلے درج کی جا چکی ہے جس میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ "تم وہ امت ہو جس کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔" (۳:۱۱۰) اسی سورۃ میں اس سے ذرا پہلے ہے: وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۳:۱۰۴) اس کا ترجمہ یوں کر لیا گیا کہ "تم میں سے ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے۔" اس سے یہ سند لے آئے کہ یہ فریضہ امت میں سے ایک خاص گروہ کا ہے اور وہ گروہ علماء یا مذہبی پیشواؤں کا ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر آیا ہے اسے پوری کی پوری امت کا فریضہ بتایا گیا ہے۔ اگر آیت (۳:۱۰۴) کا وہ مفہوم لیا جائے جس کے سہارے مذہبی پیشوائیت نے اپنے وجود کی سند مہیا کی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان تمام آیات کو منسوخ قرار دے دیا جائے گا جن میں اسے پوری کی پوری امت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔

اگر انہیں منسوخ نہ سمجھا جائے تو پھر قرآن کریم میں تضاد لازم آئے گا۔ یعنی وہ متعدد آیات میں اسے پوری کی پوری امت کا فریضہ قرار دیتا ہے اور ایک آیت میں امت میں سے ایک گروہ کا فریضہ۔ یہ کھلا ہوا تضاد ہے جو خود قرآن کریم کے دعویٰ کے خلاف ہے (۴:۸۲) اور جس سے قرآن مجید کی محکمیت ختم ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان حضرات نے یہ مفہوم لے کس طرح سے لیا جو قرآن کریم کی پوری کی پوری تعلیم کے خلاف ہے۔ آیت کے الفاظ ہیں۔ "وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ" انہوں نے مِنكُمْ سے فائدہ اٹھایا اور اس کا مفہوم یہ لیا کہ "تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے۔" عربی زبان کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ حرفِ مِنْ کے متعدد معانی میں سے دو معانی نمایاں ہیں۔ یعنی تبعیض اور تبیین۔ تبعیض کے معنی ہوتے ہیں۔ "میں سے" اور تبیین سے مراد ہوتی ہے "پورے کا پورا۔" عربی لغت کے ماہرین کا قول ہے کہ حرفِ مِنْ کو تبعیض (میں سے) کے معنوں میں صرف اس مقام پر لینا چاہیئے جہاں اس کی جگہ لفظ "بعض" کو بلا تکلف لا سکیں۔ جہاں ایسی صورت نہ ہو وہاں اس کے معنی تبیین کے لینے چاہیئے۔ (یعنی پورے کا پورا)۔ حوالہ کے لئے دیکھئے (اتقان) میں اس مقام پر مثال کے طور پر صرف دو آیات پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

(۱) سورۃ التغابن میں ہے: هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ (۶۴:۲) "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تم میں سے بعض کافر ہو گئے اور بعض مومن۔" ظاہر ہے کہ یہاں مِنْ کے معنی تبعیض ہی کے لئے جائیں گے۔ دوسری طرف سورۂ فاطر میں ہے: وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ (۳۵:۳۱) "اللہ وہ ہے جس نے تیری طرف وہ کتاب نازل کی جو حق پر مبنی ہے۔" اگر یہاں مِنْ کے معنے "بعض" لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کا صرف کچھ حصہ رسول پر نازل کیا۔ اس مفہوم کی رو سے اسلام کی اصل و اساس پہ پانی پھر جاتا

ہے۔ لہٰذا، اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے تمہاری طرف پوری پوری کی پوری کتاب نازل کی۔ اس میں "مِنکُم" کے یہی معنے ہیں۔ اور یہی معنی آیت (۳/۱۱۰) میں لئے جائیں گے کیونکہ سارے قرآن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ پوری کی پوری امّت کا قرار دیا گیا ہے نہ کہ امت میں سے کسی ایک گروہ کا۔ اس سے واضح ہے کہ اس آیت کی وہ تاویل جو یہ حضرات کرتے ہیں منشاء و مقصودِ قرآنی کے یکسر خلاف ہے۔

ایک اور پیچیدگی

لیکن اگر ان حضرات کی اس تاویل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے: وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ "تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو یہ فریضہ ادا کرے۔ اس سے (ان حضرات کی تاویل کی رو سے بھی) اُمت میں اس قسم کی صرف ایک جماعت کے وجود کا جواز نکل سکتا ہے، ایک سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن اُمت میں اس فریضہ کی ادائیگی کے مدعی جس قدر فرقے اور جماعتیں ہیں ان کا عدد و شمار ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس قدر کثیر تعداد کے گروہ اپنے جواز کے لئے اس آیت سے کس طرح سند لیتے ہیں؟ اس کا طریق بڑا آسان ہے۔ ان میں سے ہر گروہ کا دعوےٰ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والی جماعت ہم ہیں۔ باقی تمام فرقے اور جماعتیں اپنے دعوے میں جھوٹی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب کوئی شخص ایک نئی جماعت کی تشکیل کا ارادہ کرتا ہے تو اسے پہلے سے موجود فرقوں اور جماعتوں کو (CONDEMN) کرنا پڑتا ہے۔ یعنی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان جماعتوں میں سے کوئی بھی اس فریضۂ خداوندی کو ادا نہیں کر رہی اس لئے ایک نئی جماعت کی تشکیل ناگزیر ہے۔

ایک اور جماعت!

مثال کے طور پر جماعت اسلامی ہی کو لیجئے جو اس دعوے کی سب سے بڑی مدعی ہے۔ مودودی صاحب کسی جماعت کے بغیر اپنے خیالات کی اشاعت کرتے چلے آ رہے تھے۔ اور جماعت سازی کو تفرقہ پردازی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا تھا:۔

> مسلمان قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ "تنظیم نہیں" تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔
>
> (مسلمان اور سیاسی کشمکش۔ جلد اوّل۔ ص۵۹)

اس کے بعد جب ان کے دل میں اپنی الگ جماعت کے قیام کا خیال ابھرا تو یہ "تفرقہ پردازی اور گروہ بندی" نہ رہی بلکہ عین تقاضائے اسلام قرار پاگئی۔ اس کے لئے، جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے یہ ضروری تھا کہ پہلے باقی جماعتوں کو (CONDEMN) کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں لکھا:۔

> اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد نکلیں گی خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علماء دین اور مفتیانِ شرع متین۔ دونوں قسم کے راہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔۔۔۔ انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور صالح جماعت

کا برسرِ کار آنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے ۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے ۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوم ۔ صفحہ ۹۵،۱۰۴،۲۰۱)

اس طرح انہوں نے اپنی جماعت کی تشکیل کی اور اس کے جواز میں سند اسی آیت کی پیش کر دی ۔ اس سے یہ نہیں ہوا کہ پہلے سے موجود فرقوں اور جماعتوں نے کہہ دیا ہو کہ ہم سب واقعی راہ گم کردہ ہیں اس لئے ہم اپنے وجود کو ختم کرتے ہیں ۔ اس فریضہ خداوندی کی ادائیگی کے لئے یہی نئی جماعت موجود ہے ۔ مودودی صاحب نے انہیں راہ گم کردہ قرار دیا تھا ۔ انہوں نے اپنے آپ کو برسرِ حق اور جماعت اسلامی کو راہ گم کردہ قرار دے دیا اور اس طرح یہ سب اپنی اپنی جگہ قائم اور مطمئن رہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر ۔ یہی وہ فرقہ بازی، روشِ تفرقہ سازی ہے جسے قرآن کریم شرک کہہ کر پکارتا ہے ۔ جب کہتا ہے کہ

یہ شرک

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱-۳۲)

اے مسلمانو دیکھنا تم ایمان لانے کے بعد مشرکین میں سے نہ ہو جانا ۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور خود بھی ایک فرقہ یا جماعت بن گئے ۔ اس تفرقہ بازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر گروہ اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر ۔ جب تک کوئی فرقہ یا جماعت (حزب) یہ ذہنیت نہ پیدا کرے اس کا جداگانہ تشخص باقی نہیں رہ سکتا ۔ الگ تشخص کے لئے دو شرائط لازمی ہیں ۔ جماعت کے اندر عصبیت اور دوسروں کے خلاف نفرت ۔ اور یہ دونوں چیزیں اسوقت پیدا ہوتی ہیں جب آپ اپنے کو برسرِ حق اور دوسروں کو باطل پرست قرار دیں ۔ ہر فرقہ اور ہر جماعت کی یہی کیفیت ہوتی ہے ۔

عقیدتاً تو ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے لیکن بعض اوقات ذاتی مصلحتیں انہیں بعض دوسری جماعتوں کے برسرِ حق ہونے کے اعتراف پر مجبور کر دیتی ہیں ۔ مثلاً ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ جب مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی طرح ڈالی تو یہ کہہ کر کہ ملک کے تمام علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین سب کے سب راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور تمام فرقے اور جماعتیں جنسِ کاسد ہیں ۔ لیکن جب یہاں انہوں نے ان ہی علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین کے اتحاد سے متحدہ محاذ قائم کیا تو فرمایا :-

> موجودہ حالت میں ایسی جماعتوں کی ضرورت ہے جو مسلمانوں میں دین کا علم پھیلانے کی کوشش کریں اور ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کے لئے جدوجہد کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ وہ تفرقہ نہیں جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے بلکہ یہ اس آیتِ قرآنی کے منشاء کے عین مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا چاہیئے جو نیکی کی طرف بلائے اور برائیوں سے روکے ۔
>
> (نوائے وقت بابت ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۸ء)

چلتے چلتے یہ بھی دیکھئے کہ مودودی صاحب نے قرآنی آیت کا ترجمہ تو یہ کیا ہے کہ "تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا چاہیئے" لیکن کہا یہ ہے کہ "موجودہ حالت میں ایسی جماعتوں کی ضرورت ہے ۔" آپ نے غور فرمایا کہ جب انسان پہ مفاد پرستی کے جذبات غالب آجاتے ہیں تو وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کس قسم کی متضاد باتیں کرتا ہے ۔

یہ ہے میرے عزیز! جماعت سازی کے متعلق قرآن کریم کی واضح تعلیم ۔ وہ امت میں مختلف جماعتوں اور فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیتا ہے ۔ میری زندگی کا مشن امت میں اس احساس کا پیدا کرنا ہے کہ اسلام اور وحدتِ امت لازم و ملزوم

میرا مشن ہے اور اس کے لئے قرآنی مملکت کا قیام ناگزیر ہے۔ میں اس فکر کو، الگ فرقہ، پارٹی یا جماعت بنائے بغیر عام کئے چلا جا رہا ہوں۔ مختلف مقامات پر جو لوگ اس فکر سے متفق ہوتے ہیں وہ مل بیٹھتے ہیں یہ سوچنے کے لئے کہ اس فکر کو باہمی تعاون سے عام کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ اس تعاونی شکل کا نام بزم طلوع اسلام ہے اور اسی کو میں اجتماعی کوشش سے تعبیر کرتا ہوں۔ چونکہ اس قرآنی فکر کی کامیابی سے مختلف فرقوں اور جماعتوں کا وجود باقی نہیں رہتا اس لئے ان کی طرف سے اس کی مخالفت لابدی ہے۔ مجھے ان کی اس مخالفت کا نہ کوئی گلہ ہے نہ افسوس۔ افسوس اس امر کا ہے کہ وہ اس مخالفت میں جھوٹے پروپیگنڈے اور بہتان تراشیوں سے کام لیتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انہیں بتایا گیا ہے کہ "زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے" (مودودی صاحب)۔ ان ہی بہتان تراشیوں میں ایک شاخسانہ پرویزی فرقہ کا بھی ہے۔ آپ سوچیئے کہ جو پرویز فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہو وہ خود ایک فرقہ بنائے گا؟ لیکن یہ اس کی رٹ لگائے چلے جاتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں ایک جماعت ضرور قائم کر دوں :-

لوگ اسے فرقہ تو ضرور کہیں گے لیکن کم از کم بے چین روحوں کو تو کوئی جائے سکون نظر آ سکے گا۔

لوگوں کی تسکین کی خاطر ہی سہی مجھے آپ کی اس سادگی پر رحم بھی آیا اور ہنسی بھی۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ فرقہ سازی شرک ہی سہی لیکن اس سے کچھ بے چین روحوں کی تسکین کا سامان تو مہیا ہو جائے گا۔ یہ اسی قسم کی فرمائش ہے جیسی فرمائش بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے یہ کہہ کر کی تھی کہ ہمیں ایک بت بنوا دیجئے تاکہ ہم اپنے جذبۂ صنم پرستی کی تسکین کر سکیں۔ اس قسم کی تسکین کا سامان کوئی سامری تو بہم پہنچا سکتا ہے۔ وحیٔ خداوندی کا متبع ایسا نہیں کر سکتا۔ یاد رکھیئے! اس قسم کا سکون وہ فریب نفس ہوتا ہے جو مذہبی افیون سے پیدا ہوتا ہے — یہ دیر و کنشت، صومعے، بتکدے، درگاہیں، خانقاہیں، تکیے، زاویے — سب اسی فریب سکون کی تلاش کے مظاہر ہیں۔ غالب کے الفاظ میں ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا　　وا ماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

اسلام انہیں مٹا کر وہ اطمینان دلانے کے لئے آیا تھا جو علیٰ وجہ البصیرت' دل و دماغ کے مطمئن ہو جانے کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

نماز کیسے پڑھی جائے آپ نے جماعت سازی کے سلسلہ میں نماز کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور یہ بالکل فطری امر تھا۔ اس لئے کہ وہ نماز جو وحدتِ اُمت کا محسوس مظہر تھی آج امت میں تفرقہ کی بیّن علامت بن گئی ہے۔ دس ہزار مسلمان ایک جلسے میں بیٹھے مقرر کی تقریر سُن رہے ہوں گے اور ان میں باہمی تفرقہ کا شائبہ تک دکھائی نہیں دے گا۔ لیکن جونہی اذان کی آواز کانوں تک پہنچے گی وہ اجتماع مختلف ٹولیوں میں بٹ جائے گا اور اپنے اپنے امام کے پیچھے نماز پڑھے گا۔ اس قسم کی تشتت خیز نمازوں کا نقشہ آپ متحدہ محاذ میں شامل ان جماعتوں میں دیکھ چکے ہیں جنہیں مودودی صاحب دین کی تبلیغ کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں :-

جب اجتماعی کوشش کی صورت میں کسی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے گا تو دین کے اہم ترین رکن نماز

کے بارے میں بھی آپ کو بتانا ہوگا کہ کس طرح مل کر پڑھی جائے۔ آپ کی ابتدائی ریسرچ ہوگی کہ حضورؐ پاک اور ان کے صحابہؓ نے کس طرح نماز پڑھی تھی۔

ریسرچ میرے عزیز! اگر آج کسی طرح بھی حتمی اور یقینی طور پہ یہ معلوم ہو جائے کہ حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ نے کس طرح نماز پڑھی تھی (اور دیگر ارکانِ اسلام ادا فرمائے تھے) تو امت کے کس قدر اختلافات مٹ جائیں؟ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ یہ سن کر آپ کو حیرت تو ضرور ہوگی لیکن جب یہ حقیقت ہے تو (بادلِ ناخواستہ ہی سہی) مجھے یہ کہنا اور آپ کو سننا پڑے گا۔ آج کوئی ذریعۂ تحقیق ایسا نہیں جس سے حتمی طور پہ یہ معلوم کیا جا سکے۔ یہ بڑا اہم اور نازک معاملہ ہے۔ اس لئے اس پہ ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے اپنے عرصۂ نبوت میں نمازیں پڑھیں اور تنہا اور خلوت میں نہیں پڑھیں، ہزارہا صحابہؓ کی معیت میں پڑھیں۔ یہ کوئی نظری مسئلہ نہیں تھا جس کے مفہوم کے سمجھنے میں اختلاف ہو جاتا۔ یہ ایک محسوس عمل تھا جسے صحابہؓ نے رسول اللہؐ کو کرتے ہوئے دیکھا اور خود بھی حضورؐ کی اقتداء میں ویسے ہی کیا۔ پھر حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے بھی اس عمل کو جاری رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس تمام دوران میں نماز کی ایک ہی شکل ہوگی۔ عملِ محسوس کی صورت یہ ہے کہ وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک اسی شکل میں منتقل ہو جاتا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ صحابہؓ کے زمانے سے آج تک امت کا سلسلہ متواتر چلا آ رہا ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ کسی زمانے میں سابقہ امت پوری کی پوری ختم ہو گئی ہو اور پھر کچھ عرصہ کے خلاء کے بعد ایک نئی امت وجود میں آئی ہو۔ ایسا نہیں ہوا۔ امت کا تواتر اور تسلسل برابر قائم رہا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر نماز کی وہ شکل جو عہدِ رسالتمآب میں قائم ہوئی تھی اسے اسی شکل میں آج تک قائم رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن آج ہی نہیں ہمارے ہاں صدیوں سے یہ حالت ہے کہ مختلف فرقوں کی نمازیں مختلف ہیں۔ اور ان اختلافات

تواتر محسوس کی شدت کا یہ عالم ہے کہ ایک فرقے کا پیرو دوسرے فرقے والوں کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتا۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ اس نماز کا کیا ہوا جو صدرِ اوّل میں قائم ہوئی تھی اور اس کی جگہ یہ مختلف نمازیں کہاں سے آ گئیں؟ ہمارے ہاں کے لٹریچر میں اس کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ آپ فرمائیے کہ ہمارے پاس وہ کون سا ذریعہ ہے جس سے یقینی طور پہ کہا جا سکے کہ اُس نماز کی یہ شکل تھی۔

اب آگے بڑھیئے۔ ہر فرقہ اپنی نماز کی تائید میں احادیث پیش کرتا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے ہاں احادیث

احادیث کے ان مجموعوں میں بھی جنہیں صحیح تسلیم کیا جاتا ہے نماز کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ اور ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے اپنی نماز کی شکل صحیح حدیثوں پہ قائم کر رکھی ہے۔ آپ فرمائیے کہ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے حتمی طور پہ یہ کہا جا سکے کہ ان میں سے فلاں احادیث کی رو سے نماز کی جو شکل قائم ہوتی ہے وہ رسول اللہؐ کی نماز تھی۔ ایسا کوئی ذریعہ نہیں۔

تاریخ احادیث سے آگے بڑھ کر تاریخ کی طرف آئیے۔ اسے بھی ہم دنیا کے سامنے بڑے فخر سے پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن ذرا حقائق کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ اس کی پوزیشن کیا ہے۔ مدینہ منورہ عہدِ رسالتمآبؐ اور اوّلین میں

خلفائے راشدین کے زمانے تک اس مملکت کا دارالخلافہ رہا جس کی حدود مختلف براعظموں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی وسیع و عریض مملکت کے نظم و نسق کے لئے کوئی سیکرٹریٹ ہوگا۔ تحریری احکام جاری ہوتے ہوں گے، دستاویزات ضبطِ تحریر میں لائی جاتی ہوں گی۔ مختلف ولایات کے گورنروں کے ساتھ خط و کتابت ہوتی ہوگی۔ دوسری سلطنتوں کے ساتھ معاہدات ہوتے ہوں گے۔ حکومت کی آمدنی اور خرچ کے حسابات رکھے جاتے ہوں گے۔ اس سیکرٹریٹ میں ان سب کا ریکارڈ ہوگا۔ لیکن کیا یہ حقیقت موجبِ صد حیرت نہیں کہ ان میں سے کاغذ کی ایک چٹ تک بھی ہمارے ہاں موجود نہیں۔ مدینہ منورہ اس زمانے سے آج تک مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہا اور آباد اور شاداب رہا۔ اس پر باہر سے نہ کوئی حملہ ہوا جس کی بدولت وہ ریکارڈ ضائع ہو گیا ہو۔ نہ کوئی زلزلہ آیا کہ وہ عمارات زمین میں دھنس گئی ہوں۔

وہ ریکارڈ کہاں گیا؟

نہ کوئی ایسی آگ لگی۔ نہ کوئی سیلاب آیا۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ اتنا ذخیرہ بالآخر گیا کہاں؟ اس کے متعلق نہ کسی نے کوئی تحقیق کی۔ نہ اس سوال کا کوئی جواب دیا۔ اس دور کی پہلی مفصل تاریخ تیسری صدی میں جا کر مرتب ہوئی اور وہ بھی احادیث کی طرح زبانی روایت کی بنا پر۔ کسی مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ میں نے اپنی تاریخ کو اس دور کی اصل (ORIGINAL) دستاویزات سے مرتب کیا ہے۔ یہ جو حضور نبی اکرمؐ کے دو چار نامۂ مبارک (خطوط) شائع ہوئے ہیں وہ باہر کے علاقوں کے غیر مسلموں کے ہاں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ ہے ہمارے اس دور کی تاریخ کی حالت! آپ فرمائیے کہ کیا اس کی رو سے اس دور سے متعلق حتم و یقین کے ساتھ کچھ بھی کہا جا سکتا ہے؟ اس پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ اس دور کے احوال و کوائف کے متعلق یقینی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا! اس اعتراض کا جواب میرے ذمے نہیں۔ میرے متعلق تو آپ صرف یہ دیکھئے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ حقیقت ہے یا نہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ غور کیجئے کہ ہمارے ہاں ریسرچ کے وہ کون سے ذرائع ہیں جن کی بناء پر کوئی حتم و یقین کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جو نماز ادا فرمائی تھی اس کی ہیئت اور تفصیلات یہ تھیں۔ "حتم و یقین" کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے خلاف کچھ ثابت نہ کیا جا سکے۔ نماز کی دیگر تفاصیل کو تو چھوڑئیے۔ ہمارے ہاں اس ہزار سال میں یہ بھی طے نہیں پا سکا کہ حضورؐ نے تراویح کی آٹھ رکعت ادا فرمائی تھیں یا بیس رکعت حالانکہ اس کا تعلق محض گنتی سے ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر میں یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے ارکانِ اسلام کو جس جس طریق سے ادا کرتے چلے آ رہے ہیں ادا کرتے رہیں لیکن ایک دوسرے سے جھگڑیں نہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کا طریق سنتِ نبویؐ کے مطابق ہے لیکن کوئی بھی حتم و یقین کے ساتھ ایسا ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر ثابت کیا جا سکتا تو یہ اختلافات کیوں پیدا ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہتا ہوں کہ کسی فرد یا گروہ کو اس کا حق حاصل نہیں کہ ان طریقوں میں کوئی رد و بدل کر سکے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے کیونکہ ایسا کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی اتھارٹی نہیں ہوگی۔ اگر کبھی خلافت علی منہاج النبوۃ کے انداز کی قرآنی مملکت قائم ہو گئی تو اسے یہ اتھارٹی حاصل ہوگی کہ وہ امت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے کوئی متفقہ طریق متعین کرے۔ اتھارٹی کے بغیر فرقہ اہلِ قرآن نے ایک نئی وضع کی نماز ایجاد کی تھی۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوا کہ "کل حزب بما لدیھم فرحون" کی صف میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

میں نے اپنے حسنِ مسلک کا اوپر ذکر کیا ہے۔ میں خود بھی اسی پر کاربند ہوں۔ میں حنفی گھرانے میں پیدا ہوا اور اس لئے

اسی مسلک کے مطابق نماز پڑھتا چلا آ رہا ہوں اگرچہ میں کسی دوسرے مسلک کے پیروکاروں کے ساتھ نماز پڑھنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔

کنونشن میں نماز

آپ پوچھتے ہیں کہ میں طلوعِ اسلام کنونشن کے موقع پر نماز باجماعت کا اہتمام کیوں نہیں کرتا۔ طلوعِ اسلام کنونشن میں مختلف مسالک کے پیروکار جمع ہوتے ہیں۔ آپ فرمائیے کہ اس میں کس مسلک کے مطابق نماز باجماعت کا اہتمام کیا جائے؟ انہیں کسی ایک مسلک کے مطابق نماز پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اگر ہر مسلک کے متبعین کو اجازت دی جائے کہ پنڈال میں اپنی اپنی الگ جماعت کھڑی کر لیں تو اس سے تشتت اور انتشار کا جو عبرتناک منظر سامنے آئے گا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات کے تابع مناسب یہی ہے کہ مختلف مسالک کے لوگ مختلف مساجد میں جا کر اپنے اپنے طریق کے مطابق نماز ادا کر لیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری کنونشنوں میں آج تک کسی قسم کا کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ وہ وحدتِ فکر ونظر کی بنا پر باہمی اخوت اور مساوات کے مثالی اجتماعات ہوتے ہیں۔ مقصد ان سب کے سامنے ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ امت میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ (قرآنی مملکت) کا قیام کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اسی مملکت کی سینٹرل اتھارٹی کو میں مرکزِ ملت کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس کے لئے منزلِ اوّل یہ ہے کہ مسلمانوں کی ذہنیت میں قرآن کے مطابق تبدیلی پیدا کی جائے۔ اور یہ چیز قرآن کریم کے بتائے ہوئے طریق کے عین مطابق ہی نہیں بلکہ لاینفک ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس میں نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ کی جائے۔ اس کے لئے سب سے پہلے قوم کے دل و دماغ میں اس حقیقت کا راسخ کرنا ہے کہ وحدتِ اُمت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ مسلمانوں میں مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیاں یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی داعی جماعتیں یہ سب تفرقہ کا موجب ہیں اور تفرقہ قرآن مجید کی رو سے شرک ہے۔ اگر، جیسا کہ آپ نے کہا ہے، میں بھی ایک الگ جماعت بنا لوں تو اس کا مطلب ہو گا کہ میں مذہب کے بتکدہ میں ایک اور بت کا اضافہ کر دوں۔ میں اس تصور سے ڈرتا اور کانپتا ہوں۔ میرے پارٹی بنائے بغیر قرآنی مفہوم کے عام کرنے کی طرح ڈالی اور توفیق ایزدی سے اس میں مجھے اپنے اندازہ سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اگر مذہب پرست طبقہ، جو قرآنی مملکت کے قیام میں اپنے وجود کی نفی دیکھتا ہے، اس کی مخالفت نہ کرتا اور جھوٹے پراپیگنڈے کی بنا پر اس کے راستے میں روڑے نہ اٹکاتا تو یہ کامیابی اور بھی زیادہ ہوتی۔ آپ سوچئے کہ ایک طرف ان کی طرف سے پیدا کردہ مشکلات اور دوسری طرف میرا یہ اصول کہ اس مقصد کے لئے نہ صدقہ نہ خیرات، نہ نذر نہ نیاز، نہ فطرانہ نہ زکوٰۃ یا قربانی کی کھالوں کی رقوم جمع کرنی ہیں اور۔ نہ ہی کسی بیرونی ملک سے امداد حاصل کرنا تو ایک طرف، خود اپنی پبلک سے بھی چندہ نہیں مانگتا —— جو کچھ کرتا ہے خود اپنے وسائل ہی سے کرتا ہے —— ان موانعات اور اس کوتاہ دامانی کے باوجود اس باب میں اس قدر کامیابی کا سبب اس کے سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ حق کی آواز ہے اور حق کی آواز کو اگر تھوڑا سا بھی محسوس سہارا میسر آ جائے تو وہ اپنے زور دروں سے بڑی تیزی سے آگے بڑھ جاتی ہے۔

یہ ہے عزیزمن! میرا مقصدِ میری زندگی کا مشن اور میرا طریقِ کار۔ جو احباب اس سے بطیبِ خاطر متفق ہوتے ہیں وہ اس فکر کو آگے بڑھانے میں باہمی تعاون سے کام لیتے ہیں۔ اس مشن کو اور آگے بڑھانے اور اسے اپنی زندگی

ان کے بعد بھی اس چراغ کو زندہ رکھنے کے لئے قرآنک ریسرچ سنٹر اور درس گاہ کے قیام کا پروگرام میرے سامنے ہے۔ اس کے راستے میں جو روڑے اٹکائے گئے اور جو مشکلات پیدا کی گئیں انہیں

کسی بتکدہ میں کروں بیاں تو صنم بھی کہے ہری ہری

لیکن بفضلِ تعالیٰ ان مشکلات پر قابو پا لیا گیا ہے اور مجھے امید ہے کہ اس سلسلے میں عملی پیش رفت جلد سامنے آجائے گی۔ اگر میری زندگی نے ایفا کی تو میں امید کرتا ہوں کہ میں اسے اپنے سامنے بارآور ہوتا دیکھ لوں گا۔ وَبِیَدِہٖ التَّوفِیق۔

سوالات کے جواب

آپ نے اپنے خط کے آخیر میں کچھ متعین سوالات پوچھے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو کا جواب تو تصریحاتِ بالا میں آگیا ہے ــــ یعنی نماز کے طریق اور الگ پارٹی کے قیام کے متعلق۔

آپ کا تیسرا سوال ہے :-

۳۔ کیا آپ نے کبھی حج فرمایا، ہندوستان کے علاوہ کسی اور ملک کے دورے پر برائے تعلیم یا ریسرچ بھی تشریف لے گئے۔

جواب ــــ جی نہیں ــــ ذاتی طور پر مجھے اس کی استطاعت نہیں اور عوام کے پیسوں پر ایسا کرنا میرے لئے قابلِ قبول نہیں۔

آپ کا چوتھا سوال یہ ہے :-

۴۔ اسلام میں خلافت کا معیار اور طریق انتخاب کیا ہے جو قرونِ اولیٰ یا زمانۂ خلفاء راشدینؓ میں اختیار کیا گیا تھا۔ قرآن کیا کہتا ہے اور اب موجودہ دور میں کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کیا صحابہ ثلاثہؓ کا طریق درست تھا۔

جواب۔ معلوم نہیں "خلافت" سے آپ کی مراد کیا ہے۔ اگر اس سے مراد اسلامی حکومت ہے تو جو حکومت اپنے جملہ معاملات میں قرآنی اقدار کی پابند ہو اسے اسلامی حکومت یا خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جائے گا۔ جہاں تک انتخاب یا حکومت کے کسی اور طریق کار کا تعلق ہے اس باب میں ایک اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن مجید نے جن امور کی تفصیلات خود متعین نہیں کیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل اور ابدی قرار دینا منشاءِ خداوندی نہیں تھا۔

اصول اور تفصیلات

اس نے اصول اور حدود متعین کر دیئے اور اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ان کی تفاصیل اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کرے۔ یہ حدود اور اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی لیکن ان کی جزئیات اور انہیں روبہ عمل لانے کا طریق کار ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بدلتا رہے گا۔ بنا بریں کسی ایک زمانے میں اختیار کردہ طریق آنے والے زمانوں کے لئے لازمی نہیں قرار پاتا۔ لہٰذا، ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ صحابہؓ نے کیا طریقِ عمل اختیار کیا تھا۔ اوّل تو جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا، ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں جس کی رو سے ہم حتمی اور یقینی طور پر کہہ سکیں کہ انہوں نے کیا طریق کار اختیار فرمایا تھا۔ چونکہ قرآنِ کریم نے انہیں مومنین حقّہ قرار دیا ہے اس لئے یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جو طریق بھی اختیار فرمایا ہوگا وہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اختیار کیا ہوگا۔ اس کی

تفصیل آپ کو میری کتاب شاہکار رسالت میں ملے گی)۔ دوسرے یہ کہ ہم پر اس کی من وعن پابندی لازمی نہیں۔ انہوں نے وہ طریق اپنے حالات کے مطابق اختیار کیا ہوگا۔ قرآن نے اصول یہ بیان فرمایا ہے کہ امور مملکت باہمی مشاورت سے طے کرو۔ اس مشاورت کا طریقہ کیا ہوگا۔ اسے اس نے ہم پر چھوڑا ہے کہ ہم اپنے حالات کے مطابق جو طریق کار مناسب سمجھیں اختیار کرلیں ـــــ شرط یہ ہوگی کہ یہ طریق کار قرآن مجید کے اصول، اقدار اور حدود سے متصادم نہ ہو۔

آپ پوچھتے ہیں کہ "موجودہ دور میں کون سا طریقہ اختیار کیا جائے"۔ میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے وہ قرآنی حکومت کے متعلق ہے۔ یعنی اس حکومت کے متعلق جو قرآنی اصول و حدود کی پابند ہو۔ اس وقت دنیا میں کوئی حکومت بھی ایسی نہیں۔ جب کوئی اسلامی حکومت قائم ہوگی تو وہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے جو طریق کار بھی اپنے لئے متعین کرے گی وہ اسلامی قرار پا جائے گا۔ ہماری حالت بھی عجیب ہے۔ اسلامی حکومت تو کہیں موجود نہیں اور ہم ان بحثوں پر لٹھم لٹھا ہوتے رہتے ہیں کہ حکومت سے متعلق اسلامی احکام کیا ہیں۔ اس وقت جن طرق و احکام کو اسلامی یا شرعی کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ کسی فرقہ کے فقہی احکام ہوتے ہیں۔ انہیں اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ یوں بھی وہ احکام کسی خاص زمانہ کے حالات کے مطابق مدون ہوئے تھے جو آج کے حالات میں فٹ نہیں بیٹھ سکتے۔ اور صحیح اسلامی احکام غیر اسلامی حکومت میں فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ اگر کوئی حکومت اسلامی بننا چاہتی ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے فیصلہ کرے کہ اس کا جملہ کاروبار حدود قرآنی کے اندر رہتے ہوئے بروئے کار آئے گا۔ اس کے بعد وہ جو فیصلے قرآن کریم کے مطابق کرے گی وہ اسلامی کہلائیں گے۔ اس وقت امت میں جو خلفشار ہے وہ ان حقائق کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے۔

باقی رہا آپ کا یہ سوال کہ "کیا صحابہ ثلاثہؓ کا طریق درست تھا"۔ سو اول تو (جیسا کہ لکھا جا چکا ہے) ہم یقینی طور پر کہہ ہی نہیں سکتے کہ ان کا طریق کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہمیں ان کے اعمال و کردار کو موضوع بحث بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ حضرت عمرؓ یا حضرت صدیق اکبرؓ کا طریق درست تھا یا نہیں۔ وہ ہم سے ہمارے طریق ہی کے متعلق پوچھے گا۔ اس نے یہ بنیادی اصول بیان کر دیا ہے کہ

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ

یہ لوگ اپنے وقتوں میں دنیا سے چلے گئے۔ جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے تھا جو کچھ تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔
تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

چونکہ قرآن مجید نے جماعت صحابہؓ کے متعلق کہا ہے کہ وہ سچے اور پکے مومن تھے ([illegible]) ان کے لئے جنت کی بشارت ہے ([illegible]) (تفصیل شاہکار رسالت میں ملے گی) لہٰذا، قرآن مجید کی اس شہادت کی بناء پر ہمارا یہ ایمان ہونا چاہیئے کہ صحابہؓ کبار کی سیرت قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ عہد رسالتمآبؐ اور زمانۂ صحابہؓ کی تاریخ اور احادیث کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو باتیں قرآن کریم کے مطابق ہیں انہیں میں صحیح سمجھتا ہوں، جو قرآن کے خلاف ہیں انہیں غلط قرار دیتا ہوں۔ اسی قسم کی احادیث کے صحیح ہونے کا انکار ہے جس کی بناء پر مجھے منکر حدیث فلہٰذا کافر قرار دیا جاتا ہے۔

آپ کا آخری سوال یہ ہے:-

کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ فقط زیارت کے لئے!

جواب۔ جی ہاں۔ میرے درویش خانہ کا دروازہ ہر متلاشی حق کے لئے کھلا ہے۔ جب کسی کا جی چاہے (وقت مقرر کر لینے کے بعد) ملاقات ہو سکتی ہے لیکن محض زیارت کے لئے نہیں۔ زیارت تو قبروں کی کی جاتی ہے۔ زندہ انسانوں سے تو کچھ سیکھنے سکھانے کے لئے ملا جاتا ہے۔

آخر میں میں اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا خط جس حسن نیت کا آئینہ دار ہے وہ درخور تحسین ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کے قرآنی ذوق میں برکت عطا فرمائے۔ والسلام ـــــ پرویز

حقائق و عبر

(۱) کتاب الحیل

ہمارے زمانے میں نظام سرمایہ داری کے خلاف جو نفرت پھیلی تو اس کی سب سے بڑی زد سود پر پڑی۔ اس سے ہماری مذہبی پیشوائیت بلبلا اٹھی۔ آپ پوچھیں گے کہ مذہبی پیشوائیت کا سود سے کیا تعلق جو اس پر زد پڑنے سے یہ حضرات بلبلا اٹھے ہیں؟ لیکن بات بڑی صاف اور سیدھی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا سارا دارومدار سرمایہ داروں کے سہاروں پر ہوتا ہے۔ ان کی ذاتی ضروریات۔ ان کی نام نہاد "دینی خدمات" ان کی مذہب کے لبادوں میں لپٹی ہوئی سیاسی تحریکات، سب سرمایہ داروں کے سہارے چلتی ہیں۔ اس لئے سرمایہ داروں پر کسی قسم کی زد پڑنے سے ان کا پریشان ہو جانا لازمی ہے۔ یہ وجہ ہے جو یہ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ سود کا اقتصادی نظام مٹنے نہ پائے۔ مثلاً بلا سود بینکاری کے سلسلے میں مودودی صاحب نے یہ تدبیر بتائی ہے:-

> روپیہ جمع کرانے والوں کو سود دینے کے بجائے بینک ایسے اقتصادی منصوبے تیار کریں گے جن کے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے برابر کے حقدار ہوں گے۔ (ایشیا ۵ نومبر ۱۹۷۸ء)

یعنی بینک اس وقت جو کچھ سود کے نام سے دیتے ہیں اسے منافع کہہ دیا جائے تو یہ حلال و طیب ہو جائے گا۔

یہ تو رہا کاروباری حلقے کا سود۔ جو لوگ انفرادی طور پر اپنی احتیاج سے مجبور ہو کر دوسروں سے قرض لیتے ہیں اور وہ سود کی شرط پر قرض دیتے ہیں ان کے لئے اس گناہ سے بچنے کے لئے بھی تدابیر بتائی جا رہی ہیں۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ فقہ کی کتابوں میں پہلے تو شرعی احکام درج ہوتے ہیں اور آخر میں ایک باب میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ان احکام سے بچ نکلنے کی کیا تدابیر ہیں۔ اسے "کتاب الحیل" کہا جاتا ہے۔ (یعنی EVASION کی تدابیر)

ہمارے سامنے ایک کتاب آئی ہے جس کا نام ہے "معاشیات نظام مصطفیٰ"۔ مصنف ہیں مفتی محمد ابوسعید غلام سرور قادری (ایم اے اسلامک لاء)۔ ہمارے پیش نظر اس کتاب پر تبصرہ نہیں۔ ہم صرف اس کے "باب الحیل" کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں پہلے سود کے خلاف اسلامی احکامات کا ذکر ہے، اور اس کے بعد سود سے بچنے کی تدابیر درج ہیں۔ انہیں آپ بھی ملاحظہ فرما لیجئے:-

> پہلی تدبیر ۔۔۔۔ ایک شخص کسی کو دس روپے قرض دے کر اس سے دو روپے زائد لینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دو روپے سود ہوں گے۔ لیکن اس جرم اور گناہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا، قرض لینے والے کی کوئی چیز دس روپے میں نقد خرید لے اور اُسے قرض لینے والے کے ہاتھ مدت معینہ کے لئے بارہ روپے میں ادھار بیچ دے۔ اس مدت کے بعد قرض لینے والا۔ قرض دینے والے کو بارہ روپے ادا کر دے۔ اس فقہی حیلہ سے یہ زائد دو روپے حلال و طیب قرار پا

جائیں گے۔

دوسری تدبیر ـــــ قرض دینے والا اپنی کوئی چیز ایک سو دس روپے میں قرض لینے والے کے ہاتھ ادھار بیچ دے۔ قرض لینے والا اس چیز کو کسی اور کے ہاتھ ایک سو روپے میں نقد بیچ دے۔ قرض دینے والا اس چیز کو اس شخص سے سو روپے میں خرید لے۔ اس طرح وہ چیز بھی قرض دینے والے کو واپس مل گئی اور قرض لینے والے کے ذمے ایک سو دس روپے واجب الادا ہو گئے۔

تیسری تدبیر ـــــ قرض دینے والا قرض لینے والے کے ہاتھ ایک چیز دو سو روپے میں ادھار بیچ دے۔ پھر اُسے اس سے ایک سو روپے میں نقد خرید لے۔ قرض لینے والا معینہ مدت کے بعد اس شے کی قیمت کے طور پر اُسے دو سو روپیہ ادا کر دے گا۔ اس طرح اسے ایک سو روپیہ زائد مل جائے گا جو بالکل حلال اور طیب ہوگا۔

چوتھی تدبیر ـــــ قرض دینے والا کوئی چیز ایک مدت معینہ کے لئے بیس روپے میں اُدھار بیچ دے۔ قرض لینے والا اسے کسی اور کے پاس پندرہ روپے میں نقد بیچ دے۔ قرض دینے والا اس سے وہ چیز پندرہ روپے میں خرید لے۔ مدت معینہ کے بعد قرض لینے والا اسے بیس روپے واپس ادا کر دے گا۔ قرض دینے والے کو اپنی چیز بھی مل گئی اور پانچ روپے "رزقِ حلال" کے طور پر زائد بھی ـــــ اس طرح، رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی ـــــ اس کتاب میں لکھا ہے کہ امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ

اس سے منافع بھی ہوگا اور ثواب بھی ملے گا۔ ثواب اس لئے ملیگا کہ اسے سود جیسے حرام سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ (بحوالہ فتاویٰ قاضی خان مع عالمگیری۔ جلد دوم۔ ص $\frac{۲۷۹}{۲۸۰}$ مصری)

ان تدابیر کو درج کرنے کے بعد اس کتاب کے مصنف فرماتے ہیں کہ ان تدابیر کی رو سے منافع بھی مل گیا اور سود گناہ بھی نہ ہوا۔

لیکن افسوس کہ مسلمان دینِ فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر سود ایسی لعنت میں مبتلا ہیں۔

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارے (ص ۱۷۲)

اس سے آپ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ہوگی کہ یہ لوگ قرآن سے کیوں بھاگتے ہیں اور فقہی قوانین کو نافذ کرنے پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔

---

(۲) ایک مبارک اقدام

مساوات مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۹ء میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

"لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس مولوی مشتاق حسین، مسٹر جسٹس آفتاب حسین اور مسٹر جسٹس جاوید اقبال پر مشتمل شریعت بنچ نے حدود آرڈی ننس (زنا) مجریہ ۱۹۷۹ء کی مختلف دفعات کے خلاف موضع موسیٰ غلام تحصیل علی پور (ضلع مظفر گڑھ) کے محمد بخش کی شریعت درخواست باقاعدہ سماعت کے لئے منظور کر لی ہے۔ فاضل بنچ نے وفاقی حکومت (اٹارنی جنرل آف پاکستان) ایڈووکیٹ جنرل پنجاب اور

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کے نام نوٹس جاری کر دیئے ہیں۔ درخواست میں استدعا کی گئی ہے کہ آرڈیننس میں متعین کی گئی سنگساری کی سزا کو غیر اسلامی قرار دیا جائے کیونکہ آرڈیننس کی دفعات قرآنی تعلیمات پر پوری نہیں اترتیں۔ درخواست کی پیروی شمیم عباس بخاری ایڈووکیٹ نے کی۔

شریعت درخواست میں وفاقِ پاکستان کو فریق بناتے ہوئے مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ نفاذ حدود زنا کے آرڈیننس نمبر ۷ مجریہ ۱۹۷۹ء کی دفعہ ۲ (اے)، (بی)، (ڈی)، (ای)، ۵، ۶ (۲)، ۸ اور ۱۷ اسلامی قوانین کے خلاف ہے کیونکہ یہ دفعات قرآنی تعلیمات پر پوری نہیں اترتیں اور یہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کی طرف سے تسلیم شدہ اصول ہے کہ جو حدیث قرآنِ پاک کی تعلیمات کے خلاف ہو اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن پاک کو صحیح اور درست حالت میں رکھنے اور اس میں کسی قسم کی تحریف اور تصریح نہ ہونے کی ذمہ داری (خود خدا نے) اپنے ذمے رکھی ہے لیکن حدیث کے بارے میں نہ تو اللہ تعالیٰ نے اور نہ ہی حضور سرورِ کائنات نے اس قسم کی ذمہ داری قبول کی ہے اور یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ احادیث حضورؐ کی وفات کے کئی دسوں سال بعد جمع کی گئیں۔ حدود آرڈیننس مدعا علیہ کی طرف سے فروری ۱۹۷۹ء میں گزٹ نوٹیفکیشن کے ذریعے نافذ کیا گیا اس میں دی گئی شرائط اور دفعات اسلامی قوانین کے خلاف ہیں اور کالعدم قرار دیئے جانے کے قابل ہیں آرڈیننس میں بالغ عمری کا تعین بھی اسلام کے خلاف ہے کیونکہ اسلام میں اس بارے میں عمر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ آرڈیننس میں حد کی تشریح بھی غلط کی گئی ہے۔ حد ایسی سزا ہے جس کا تعین حدیث کی بجائے قرآن شریف کرتا ہے۔ حدیث کے ذریعے تعین کی جانے والی سزا تعزیر کہلاتی ہے نہ کہ حد۔ حد کی تشریح قرآنِ پاک میں کر دی گئی ہے۔ ان کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ دفعہ ۲ (ڈی) میں محصن اور محصنہ کی تعریف مسلمان بالغ مرد اور عورت کی گئی ہے۔ اور قرآنِ پاک میں یہ لفظ متعدد جگہ استعمال کیا گیا ہے جو دونوں کو ناجائز جنسی تعلقات کے قیام سے منع کرتا ہے اور اس مقصد کے لئے شادی کی ترغیب دیتا ہے۔ دفعہ ۲ (ای) میں لفظ تعزیر کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ اور یہ اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔ قرآنِ پاک زانی اور زانیہ دونوں کے لئے جرم ثابت ہو جانے پر ایک سو کوڑوں کی سزا کا حکم دیتا ہے۔ جب کہ وہ اپنی مرضی سے یہ فعل انجام دیں۔ زانی اور زانیہ کو موت تک سنگسار کئے جانے کا اصول قرآن پاک میں ہرگز نہیں ہے۔ یہ کسی اور جگہ سے درآمد کیا گیا ہے۔ قرآن پاک عبرت آموز سزا دیتا ہے لیکن اس میں حضورِ اکرمؐ کی طرف سے بھی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ احادیث میں بھی سنگساری کے بارے میں چند افراد کا ذکر ہے جن کو سنگسار کیا گیا۔ وہ بھی یہودی تھے۔ ان کو بھی توریت کی تعلیمات کے مطابق سزا دی گئی تھی۔ اس سزا کا ذکر ابھی تک بائیبل میں موجود ہے۔ خلفائے راشدینؓ کے دور میں بھی یہ مسئلہ بنا رہا کہ آیا سنگساری اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ قرآنی تعلیمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سزا غیر اسلامی ہے۔ لہٰذا استدعا ہے کہ آرڈیننس کی ان دفعات کو غیر اسلامی اور قرآنی تعلیمات کے خلاف قرار دیا جائے۔ اور مدعا علیہ کو ہدایت کی جائے کہ انہیں قرآنی تعلیمات کے مطابق تبدیل کرے۔ درخواست میں مزید استدعا کی گئی ہے کہ رٹ درخواست کے فیصلے تک کسی ملزم کو سنگساری کی سزا نہ دی جائے۔"

طلوعِ اسلام

ہم محترم حضور بخش صاحب کو مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں کہ انہوں نے رجعت الی القرآن کے لئے یہ مستحسن قدم اٹھایا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس میں کامیابی عطا فرمائے۔ اس ضمن میں معلوم ہوا ہے کہ کوئٹہ شریعت بنچ میں بھی سزائے رجم

کے خلاف درخواست زیرِ سماعت ہے اور پٹ درنج میں یتیم پوتے کی وراثت کے متعلق درخواست دی گئی ہے ۔ فالحمدُ للّٰہِ علیٰ ذالِک ۔ ہم ان مجد حضرات کی توجہ اس نکتہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۹ء کے صفحہ ۲۷ پر قانون دان حضرات کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا ۔ اگر یہ حضرات ان مقدمات کی روئداد یا فیصلوں سے ہمیں مطلع فرمائیں گے تو ہم ہی نہیں کتاب اللہ کی بالادستی دیکھنے کے متمنی جملہ حضرات ان کے شکرگزار رہیں گے ۔

اضافہ لمعات ۔ صفحہ ۴

ہم نے لکھا ہے کہ تقسیم ہند کے زمانے میں جہاں اکثریت کے علاقوں میں بھی مسلمانوں کے قافلے ہندوؤں کی قتل و غارت گری کی وارداتوں سے محفوظ نہیں رہ سکے تھے، جماعت اسلامی اپنے مرکزی مقام سے چل کر، ہندوؤں کے علاقوں سے گزرتی ہوئی با امن و امان لاہور پہنچ گئی تھی ۔ مودودی صاحب نے اس کی تائید ہی نہیں کی تھی بلکہ کہا تھا کہ جماعت اسلامی کے ارکان جہاں جہاں بھی تھے، وہ ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہے تھے ۔ ان کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے :-

> آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ان ملک گیر فسادات میں جہاں ہندوؤں اور سکھوں اور مسلمانوں کو جانی اور مالی دونوں قسم کا کثیر نقصان پہنچا، ہمارے ارکان میں سے اب تک خدا کے فضل سے کسی کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا حالانکہ وہ اس دوران میں گھروں میں چھپے ہوئے نہیں بلکہ میدان میں اخلاقی اصلاح اور لوگوں کو حق و انصاف کی طرف بلانے کا کام برابر کرتے رہے ۔ کئی مقامات پر وہ فساد کو روکنے میں کامیاب بھی ہوئے ۔ حتیٰ کہ ایک جگہ کے غیر مسلموں نے پبلک جلسہ کر کے جماعت کا شکریہ ادا کیا اور لوگوں کو بتایا کہ جہاں جماعت اسلامی موجود ہوگی اور لوگ اس کے زیرِ اثر ہوں گے وہاں فساد کا امکان بھی نہیں ہو سکتا ۔ ایک دوسرے شہر میں جہاں مسلمانوں کو غیر مسلموں نے کثیر نقصان پہنچایا ۔ وہیں جماعت اسلامی کے مقامی مکتبہ پر غیر مسلم بلوائیوں کے حملہ کو روکنے والا ایک غیر مسلم تھا ۔
>
> (روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم ۔ تیسرا ایڈیشن ۔ صفحہ ۲۴)

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس جماعت کو ہندوؤں کے ہاں سے اس قسم کا تحفظ کیوں حاصل تھا ؟

ایک ضروری وضاحت

معمول کے مطابق، زندہ انسانوں کے نام کے ساتھ "صاحب" اور وفات یافتہ کے نام کے ساتھ "مرحوم" لکھا جاتا ہے ۔ اس پرچہ کی کاپیاں پریس کو جا رہی تھیں کہ "مودودی صاحب" کی وفات کی خبر موصول ہوئی، اس لئے اس پرچہ میں ان کے نام کے ساتھ "صاحب" ہی ملے گا ۔ قارئین اسے ملحوظ رکھیں ۔ (۲۳ ستمبر ۱۹۷۹ء)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

عشر کے بارے میں فقہی اختلافات

پاکستان میں مبینہ "اسلامی قوانین" کے سلسلہ میں آج کل زکوٰۃ اور عشر کا بھی چرچا ہو رہا ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق ہم اس سے پہلے تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ اس کا مروجہ تصور اور اس کی تفاصیل فقہی مسائل ہیں۔ قرآن مجید میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ قرآن کی رو سے تو زکوٰۃ کا تصور ہی کچھ اور ہے۔ جہاں تک عشر کا تعلق ہے یہ بھی فقہی مسئلہ ہے قرآنی نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اسلامی مملکت کی تحویل میں رہتی ہے تاکہ وہ اس کا ایسا انتظام کرے جس سے افرادِ مملکت کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ لیکن فقہ چونکہ ہمارے دورِ ملوکیت کی تخلیق ہے اس لئے اس کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت عین مطابق اسلام ہے' اس حد تک کہ (مودودی صاحب کے الفاظ میں) اس ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی بھی عائد نہیں کی جا سکتی۔

زمین پر ذاتی ملکیت تسلیم کرنے کے بعد فقہ نے یہ طے کیا کہ اس کی پیداوار میں سے حکومت کس قدر حصہ لے سکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے زمین کو دو قسموں میں تقسیم کیا — عشری اور خراجی — عشری وہ زمین جو "شروع ہی سے" مسلمانوں کی ملکیت میں ہو اور خراجی وہ جو جسے مسلمانوں نے ملک فتح کر کے حاصل کیا ہو۔ اس لئے وہ حکومت کی ملکیت قرار پائے گی۔ عشری زمین سے حکومت' پیداوار کا (بارانی زمین سے) دسواں حصہ لے سکتی ہے اور سیرابی زمین سے بیسواں حصہ۔ عشر کو زکوٰۃ کی طرح "عبادت" قرار دیا جاتا ہے اس لئے اس کے نصاب یا مصارف میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ (یعنی قوانینِ خداوندی کو تو فقہ بدل سکتی ہے لیکن فقہی قوانین کو کوئی نہیں بدل سکتا!) خراج کو حکومت کا ٹیکس قرار دیا جاتا ہے جس کے لئے حکومت' مالکانِ اراضی سے بٹائی یا کرایہ کا معاملہ کر سکتی ہے (حالانکہ احادیث کی رو سے بٹائی یا کرایہ' ربٰو میں داخل ہے فلہٰذا حرام)۔ پاکستانی اراضی کو ارباب فقہ عشری قرار دیتے ہیں اس لئے تجویز یہ ہے کہ زکوٰۃ کے ساتھ عشر کے متعلق بھی حکومت کی طرف سے آرڈیننس نافذ کیا جائے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے قرآن کی رو سے عشری یا خراجی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ہمارے محترم پروفیسر شہاب صاحب کا اپنا انداز ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ خود فقہ کی رو سے بھی پاکستان کی اراضیات عشری نہیں خراجی قرار پاتی ہیں لہٰذا یہاں عشر کے متعلق کسی قانون کے نافذ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس دلچسپ بحث کو آپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ طلوعِ اسلام

آج کل ہمارے اخبارات میں عشر کی شرعی حیثیت کے بارے میں اختلافی بحث زوروں پر ہے۔ فقہ جعفریہ کے علماء حضرات کا کہنا ہے کہ ان کی فقہ کے مطابق، پاکستان کی اراضی پر عشر عائد نہیں ہو سکتا اس لئے اس فقہ کے پیروکار عشر ادا نہیں کریں گے۔ جب کہ حنفی فقہ کے علماء کے بیانات کے مطابق یہ پاکستان کی اراضی پر نافذ ہو سکتا ہے اس لئے وہ اصرار کرتے ہیں کہ چونکہ ملک میں حنفی فقہ کے پیروکاروں کی اکثریت ہے اس لئے فقہ جعفریہ کے علماء کے اعتراض کو کوئی اہمیت نہ دی جائے اور عشر نافذ کر دیا جائے۔

عشر، جیسا کہ اس لفظ کے لغوی معنی دلالت کرتے ہیں زمین کی پیداوار کا وہ دسواں حصہ ہے جو عرب کے کاشتکار اسلامی حکومت کو ادا کرتے تھے۔ عشر کی یہ شرح بارانی علاقے کے لئے ہے جبکہ نہری اور چاہی اراضی کے لئے اس کی شرح نصف ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں کاشتکار نہروں اور کنوؤں پر اپنی جیب سے خرچ کرتے تھے اس لئے بارانی اراضی کہ جنہیں سیراب کرنے پر کوئی خرچ نہیں اٹھتا تھا، کی نسبت ان اراضی کے کاشتکاروں پر کم بوجھ ڈالا گیا۔

عشر پر اخباری بحث کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جہاں فقہ جعفریہ والے اپنے مسلک کی تائید میں اپنے ائمہ کے اقوال نقل کر رہے ہیں حنفی فقہ کے علماء کسی قسم کی فقہی کتاب کا حوالہ دیئے بغیر صرف بیانات دینے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ آگے پڑھنے سے پہلے فقہ جعفریہ والوں کا پیش کردہ کم از کم ایک حوالہ نقل کر دیا جائے۔ اس فقہ کی معتبر کتاب "فقہ الامام جعفر الصادق" جلد دوم کے صفحہ ۲۷۷ پر یہ مسلک ان الفاظ میں درج ہے:۔

> وقد اجمع الفقہاء کلمۃ واحدۃ علی ان کل ارض فتحت عنوۃ فہی لجمیع المسلمین المجاہدین وغیر مجاہدین من وجد ومن سیوجد
>
> فقہاء کا اس مسئلہ پر مکمل اتفاق ہے کہ جو ملک طاقت کے ذریعے فتح کئے جائیں ان کی اراضی تمام مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ ان میں فتح کرنے والے مجاہد اور دوسرے تمام مسلمان جن کا تعلق کسی بھی نسل سے کیوں نہ ہو شامل ہیں۔

چنانچہ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے۔ کہ عشری اراضی کا تعلق صرف عرب سے ہے۔ باقی تمام ممالک جو مسلمانوں نے فتح کئے ان کی اراضی اسلامی ریاست کی ملکیت ہے۔

میرے خیال میں اگر حنفی فقہ کے علماء بھی بیان دینے سے پہلے اپنی کسی کتاب کا حوالہ دے دیتے تو موجودہ اختلافی بحث کی ضرورت نہ پڑتی۔ حنفی فقہ کی معتبر کتابوں میں سے سب سے چھوٹی کتاب "مالا بدّ منہ" ہے جس کے مصنف قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کا شمار برصغیر کے چوٹی کے فقہاء میں ہوتا ہے۔ ان کی اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ انہوں نے اسے مختصر رکھنے کے لئے ان تمام فقہی مسائل کو نظرانداز کر دیا ہے جن کا اطلاق برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں پر نہیں ہوتا۔ انہی مسائل میں ایک مسئلہ عشر کا ہے جس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں:۔

> ہمچنیں احکام عشر ذکر نمی کنیم کہ دریں دیار نیست (صفحہ ۸۶) اور اسی طرح احکام عشر بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس زمانے میں عشری زمین نہیں۔

اس عبارت سے پہلے قاضی صاحب زکوٰۃ کے بارے میں ان مسائل کا ذکر کرتے ہیں جو ہمارے ملک کے مسلمانوں سے

غیر متعلق ہیں۔ مثلاً جانوروں پر زکوٰۃ وغیرہ۔ اور اس کے بعد عشر کے بارے میں مندرجہ بالا اصول ارشاد فرماتے ہیں۔
عشر کے بارے میں جعفریہ فقہ اور حنفی فقہ کے جو اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ ان دو فقہی مذاہب تک محدود نہیں۔ امتِ مسلمہ کے ستر کے ستر فقہی مذاہب (کہ جن میں سے اکثر اب مُردہ ہو چکے ہیں) کے تمام فقہا کا اس امر پر اتفاق تھا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی شرعی حیثیت کے بارے میں امتِ مسلمہ کے ان فقہاء کا مسلک پیش کر دیا جائے تاکہ ایک ایسا مسئلہ جس کے اتفاقی ہونے پر اجماعِ امت ہے خواہ مخواہ اختلافات کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔

اسلامی قانون کے مطابق زرعی اراضی کی دو بڑی اقسام ہیں۔ ایک عشری اور دوسری خراجی۔ فقہائے اسلام کے متفقہ فیصلے کے مطابق عرب کی اراضی عشری کے ذیل میں آتی ہیں اور جیسا کہ معلوم ہے ان اراضی کی پیداوار سے دسواں حصہ بطور عشر وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن ہمارے ملک میں چونکہ عشری زمین ہے ہی نہیں اس لئے ہمارے لئے یہ مسئلہ نظری بحث سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ زمین کی دوسری قسم خراجی اراضی ہیں اور یہ ان ممالک کی زمین تھی جسے مسلمانوں نے فتح کیا تھا۔ جیسا کہ عراق، ایران، مصر، اور برِصغیر ہند و پاکستان۔ اسلامی قانون کے مطابق یہ مفتوحہ ممالک کہلاتے ہیں اور یہاں کی تمام اراضی اسلامی بیت المال یا اسلامی حکومت کی ملکیت قرار دے دی گئی۔ حکومت یہ اراضی کاشتکاروں کو کاشت کیلئے دیتی اور زمین کی حیثیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان سے ایک چوتھائی سے لے کر نصف تک پیداوار بطور خراج وصول کرتی۔ یہ فیصلہ حضرت عمرؓ نے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں صحابہ کرام کے مشورے سے کیا تھا۔ امام ابو یوسف نے آپ کے اس فیصلے کو جو آپ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے تقریر کرنے کے بعد دیا، ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

وقد رایت ان احبس الارضین بعلوجها واضع علیهم فیها الخراج وفی رقابهم الجزیة یؤدونها فتکون فیاً للمسلمین المقاتلة والذریة ولمن یاتی من بعدهم[1]

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اراضی اور اس کے کاشتکاروں کو (سرکاری ضروریات) کے لئے روک لوں۔ ان کی زمین پر تو خراج عائد کروں گا اور خود ان پر جزیہ لگایا جائے گا۔ جسے وہ ادا کرتے رہیں گے۔ اسی طرح یہ خراج اور جزیہ مسلمانوں کے لئے ایک مستقل آمدنی کا کام دے گا۔ جس میں مسلمان فوجی، ان کی اولاد اور آنے والی تمام نسلیں شامل ہوں گی۔

صحابہ کرامؓ نے ان الفاظ میں آپ کے فیصلے کی تائید کی:۔

الرائی رایک۔ فنعم ما قلت وما رایت۔[2]

آپ کا فیصلہ صحیح ہے آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بہت خوب ہے اور جو فیصلہ دیا ہے وہ بہت موزوں ہے۔

مستشرقین نے یہ ایک عام غلط فہمی پھیلائی ہے کہ جزیہ کی طرح خراج بھی غیر مسلموں پر زرعی ٹیکس تھا، حالانکہ جیسا کہ اس کے لغوی معنی دلالت کرتے ہیں۔ یہ سرکاری ملکیت کی زمین کی پیداوار کا ایک حصہ تھا جسے کاشتکار، چاہے وہ غیر مسلم ہوتا یا مسلمان، اسلامی حکومت کو دینے کا پابند تھا۔ عشر کی نسبت اس کی زیادہ شرح مقرر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ عظیم فتوحات سے پہلے اسلامی ریاست کی کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی جب کبھی جہاد کی ضرورت ہوتی تو تمام مسلمان اس مقصد کے لئے

---

[1] کتاب الخراج مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵۔ [2] ایضاً

اپنی خدمات پیش کر دیتے ۔ یہ خدمات رضاکارانہ ہوتیں اور جنگ کے عواقب میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آتا اس کا ایک حصّہ مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا۔ ان جنگوں کے سرکاری اخراجات بہت کم ہوتے تھے اور اراضی کی پیداوار کے دسویں حصّے سے یہ اخراجات بآسانی پورے ہو جاتے تھے ۔ لیکن جب عراق ، ایران اور مصر جیسے بڑے بڑے ممالک فتح ہوئے تو مسلمانوں کو ان مفتوحہ ممالک کے نظام کے لئے مستقل تنخواہ دار فوج کا انتظام کرنا پڑا اور جیسا کہ حضرت عمرؓ کے فیصلے سے ظاہر ہوتا ہے ان فوجوں کے اخراجات پورا کرنے کے لئے ان ممالک کی تمام اراضی کو بیت المال کی ملکیت قرار دے دیا گیا اور اسے کاشتکاروں کو ایک حصّہ پیداوار پر دے دیا گیا۔

یہ خراجی اراضی طویل عرصے تک کاشتکاروں کے قبضے میں رہتی ۔ جس سے بعض اوقات ان کاشتکاروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ وہی اس کے مالک ہیں ۔ امام ابو عبید نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الاموال" میں ایسے کئی واقعات لکھے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے :-

عن الزبیر بن عدی قال اسلم دھقان علی عھد علی فقال لہ علی ان اقمت فی ارضک رفعنا عنک جزیۃ رأسک واخذناھا من ارضک وان تحولت عنھا فنحن احق بھا۔ ؎

زبیر بن عدی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں ایک کاشتکار نے اسلام قبول کیا تو حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ اگر تم اپنی زمین پر قائم رہو گے تو تم سے جزیہ تو معاف کر دیا جائے گا لیکن تمہاری زمین سے خراج لیا جائے گا ۔ اگر تم اس زمین کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جاؤ گے تو ہم اس زمین کے زیادہ حقدار ہیں ۔ یعنی یہ زمین بیت المال کی ملکیت میں رہے گی ۔

یہ کاشتکار جب تک خراجی اراضی کی پیداوار میں سے بیت المال یا اسلامی حکومت کا حصّہ باقاعدگی سے ادا کرتے رہتے انہیں کوئی بھی ان کی اراضی سے ہٹا نہیں سکتا تھا ۔ یہاں تک کہ خود اسلامی حکومت کو بھی اس کا اختیار نہیں تھا ۔ فتاویٰ شامی کے مصنف علامہ ابن عابدین مختلف اسلامی ادوار کا عمل نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

ثم اعلم ان اراضی بیت المال المسماۃ باراضی المملکۃ واراضی الحوز اذا کانت فی ایدی زراعھا لا تنزع من ایدیھم ما داموا یؤدون ما علیھا ولا تورث عنھم اذا ماتوا ولا یصح بیعھم لھا ۔ ولکن جری الرسم فی الدولۃ العثمانیۃ ان من مات عن ابن انتقلت لابنہ مجانا والا فلبیت المال ۔ ولو لہ بنت او اخ لاب لہ ۔ ؎

بیت المال کی اراضی جنہیں سرکاری اراضی یا اراضی حوز کہا جاتا ہے جب وہ کاشتکاروں کے قبضہ میں ہوں گی تو جب تک وہ اس کا خراج ادا کرتے رہیں گے ان سے نہیں لی جا سکتی ۔ اور ان کی وفات پر نہ ہی وراثت تقسیم ہو گی اور نہ ہی وہ اسے بیچ سکتے ہیں ۔ لیکن عثمانی حکومت میں یہ رواج ہوا کہ جب زمین پر قابض کاشتکار فوت ہو جاتا تو وہ بغیر کسی قیمت کے اس کے بیٹے کو منتقل کر دی جاتی اگر بیٹا نہ ہوتا تو وہ زمین بیت المال کو واپس

؎ کتاب الاموال لابی عبید مطبوعہ مصر صفحہ ۸۴ پیرا ۲۴۲ ۔

؎ رد المحتار شرح درمختار المعروف بفتاویٰ شامی مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۳۵۴ ۔

ہو جاتی، چاہے مرنے والا کاشتکار کا حقیقی بھائی یا لڑکی موجود کیوں نہ ہوتی۔

فقہائے اسلام نے حضرت عمرؓ اور صحابہ کرامؓ کے متفقہ فیصلے کی روشنی میں برصغیر ہند کی اراضی کو بھی بیت المال کی ملکیت میں دے کر خراجی قرار دیا۔ برصغیر پر مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ اس تمام عرصے میں مذکورہ بالا فیصلے کے مطابق یہاں کی تمام اراضی اسلامی حکومت کی ملکیت تصور کی جاتی رہی یہ علیحدہ بات ہے کہ مختلف ادوار میں خراج کی شرحیں مختلف رہی ہیں۔ یا خراج کے نظام میں تھوڑا بہت فرق رہا ہے۔ حکومت کے تمام اخراجات اسی خراج کی آمدنی سے پورے کئے جاتے تھے۔ پورے ایک ہزار سال میں یہاں مختلف خیالات کے مسلمان بادشاہ حکمران رہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس میں بنیادی تبدیلی نہ کی۔ یعنی یہ کہ یہاں کی اراضی ہمیشہ حکومت کی ملکیت میں رہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ بن شاہ ولی اللہ کے زمانے میں برصغیر میں اسلامی حکومت زوال پذیر ہونا شروع ہو گئی اور مختلف صوبوں کے حکمرانوں نے مرکز سے علیحدگی اختیار کرنی شروع کی۔ ان میں سے کچھ صوبیداروں نے زمین کی خراجی حیثیت کو بدلنے کی کوشش کی تو اس وقت کے علماء نے اس کا سختی سے نوٹس لیا اور اس مضمون کے فتوے جاری کئے کہ کوئی مسلمان ان اراضی کی شرعی حیثیت میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فتوے کے الفاظ یوں تھے:۔

> اور شیخ جلال تھانیری قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک رسالہ اراضی ہند کے احکامات کے بارے میں لکھا اور اس رسالے میں انہوں نے اس مذہب کو کہ ہندوستان کی زمین، زمینداروں کی ملکیت ہے کو بہت سے دلائل و شواہد سے باطل قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی اراضی آج بھی بدستور سابق عراق کی طرح جماعۃ المسلمین کے لئے وقف ہیں یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں کسی شخص و فرد کی ملکیت نہیں اور زمینداروں کو چودھری اور نگران ہونے سے زیادہ کوئی دخل نہیں ہے۔ اور قاضی محمد علی تھانویؒ نے بھی اس بارے میں ایک رسالہ تصنیف کیا ہے اور انہوں نے اس میں شیخ جلال ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔ شاید اس مسلک کی بنیاد وہ اصول ہے جو کہ حضرت شیخ جلال تھانیری قدس اللہ سرہٗ نے اپنے رسالہ میں اختیار فرمایا ہے کہ ہندوستان کی زمین ابتدائے فتح ہی سے عراق کی اراضی کی طرح، جو کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا، بیت المال کی ملکیت پر ہی قائم ہے۔ اور زمینداروں کو اس کے سوا کہ وہ اس کے متولی اور داروغہ ہیں اور کاشتکاروں کو تلاش کرنے اور زراعت میں اعانت بہم پہنچانے اور حفاظت کے سوا کوئی دخل نہیں۔ [۱]

ان فتاویٰ کو نقل کرنے کے بعد مولانا محمد حفیظ الرحمٰن سیوہاروی (مرحوم) اپنی مشہور کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" میں برصغیر ہند و پاکستان کی اراضی کی شرعی حیثیت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

علماء اسلام کے یہ فتاویٰ مغل بادشاہوں کے دور میں اور برٹش حکومت کے ابتدائی دور میں اس سلسلہ میں زیر تحریر آئے ہیں کہ اراضی ہند اشخاص و افراد کی ملکیت نہیں۔ بلکہ وقف للمسلمین کی حیثیت میں حکومت (بیت المال) ہیں اور ایسی زمین کو اسلام کے معاشی نظام کی اصطلاح میں ارض المملکت یا ارض الحوزہ کہا جاتا ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے ارض عراق کے متعلق یہی فیصلہ فرمایا اور جمہور صحابہؓ

---

[۱] فتاویٰ عزیزی مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی جلد اول صفحہ ۴۳۔

نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر کے آئندہ کے لئے اُسوۂ حسنہ قرار دیا۔ ۹ے
جب انگریزوں نے طاقت اور دھوکے سے برصغیر کی حکمرانی مسلمانوں سے چھین لی تو انہوں نے کچھ عرصے تک جیسا کہ مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے' اسلام کے نظام اراضی پر عمل کیا۔ لیکن بعد میں ۱۷۹۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے "بنگال کا بندوبست دوامی" کے نام سے ایک قانون پاس کیا۔ اس قانون کے ذریعے ان زمینداروں کو جو اسلامی دور میں سرکاری اراضی کی نگرانی کا کام کرتے تھے' ان اراضی کے مالکانہ حقوق عطا کر دیئے گئے۔ اس کے نتیجے میں ایک دفعہ پھر زمین کی خرید و فروخت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور غیر حاضر زمینداروں کا طبقہ پیدا ہو گیا۔ اسلام نے زمین کو اسلامی مملکت کی ملکیت قرار دے کر اور بٹائی کے معاملے کو سود قرار دے کر جس زمینداری نظام کا خاتمہ کیا تھا وہ ایک دفعہ پھر زندہ ہو گیا۔

برصغیر ہندو پاکستان کے اسلامی علاقے پر انگریزوں کا قبضہ اسلامی قانون کے لئے کوئی نیا یا منفرد واقعہ نہیں تھا۔ مختلف اسلامی ادوار میں دشمن' مسلمانوں کے علاقوں پر قبضہ کرتے رہے تھے اور وہ لوگ قبضہ کرنے کے بعد اسلام کے بندوبست اراضی کو بدل کر اپنا نظام اراضی جاری کر دیتے تھے۔ تاہم مسلمانوں کا یہ لازمی فریضہ تھا کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے مسلمان علاقوں سے دشمن کی حکمرانی ختم کریں۔ چنانچہ جب مسلمان ان علاقوں کو دوبارہ فتح کر لیتے تو ان علاقوں کی اراضی کی پہلی شرعی حیثیت دوبارہ لوٹ آتی۔ یعنی خراجی زمین' ایک دفعہ پھر اسلامی حکومت کی ملکیت قرار پاتی اور کاشتکاروں سے مقررہ حصہ بطور خراج وصول کیا جاتا۔ اس سلسلے میں فقہائے اسلام کا ہمیشہ یہ متفقہ فیصلہ رہا کہ جس زمین کو ایک دفعہ خراجی قرار دیا جائے وہ ہمیشہ خراجی ہی رہے گی۔ امام المسلمین عشری اراضی کی حیثیت بدل کر خراجی میں تو تبدیل کر سکتا ہے۔ لیکن وہ خراجی کو کسی حالت میں عشری میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ فتاویٰ عالمگیری میں یہ فتویٰ ان الفاظ میں مذکور ہے:۔

> "اور صورت مسئلہ تین وجہ سے ہے ایک یہ کہ اہل حرب ہمارے کسی دیار پر غالب ہو جاویں اور دوم یہ کہ کسی شہر کے لوگ اسلام سے مرتد ہو کر غالب ہو جائیں اور احکام کفر وہاں جاری کریں۔ سوم یہ کہ کسی شہر کے ذمی اپنا عقد توڑ دیں۔ تو ان سب صورتوں میں ہر صورت میں یہ صوبہ یا شہر یا ملک جب ہی دارالحرب ہو جائے گا۔ جب کہ تینوں شرطیں مذکورہ بالا پائی جائیں ...... (دارالحرب قرار دینے کے بعد) پھر اس کو امام نے فتح کیا اور غنیمت میں لوٹ آئی۔ پھر قبل تقسیم غنیمت وہاں کے لوگ حاضر ہوئے تو اس کو مفت بغیر کچھ دیئے لے لیں گے ..... اور رہی زمین پس بعد فتح کر لینے امام المسلمین کے وہ اپنے حکم اوّل کی طرف عود کرے گی۔ یعنی اگر وہ زمین خراجی تھی تو خراجی ہو جائے گی اور اگر عشری تھی تو عشری ہو جائے گی۔ لیکن قبل اس کے کہ امام نے اس پر خراج باندھ دیا ہو تو وہ عود کرنے میں عشری نہیں ہو گی۔ ۸ے

۹ے اسلام کا اقتصادی نظام از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مطبوعہ دہلی صفحہ ۲۰۰

۸ے فتاویٰ عالمگیری اردو مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور جلد سوم صفحہ ۵۲۸٬۵۲۷

مختصر یہ کہ خراجی زمین جب بھی مسلمانوں کے قبضے میں ہو گی وہ ہمیشہ خراجی ہی رہے گی یعنی کسی فرد یا غیر حاضر زمیندار کی ملکیت نہ ہو گی بلکہ اسلامی ریاست کی ملکیت ہو گی۔

قیامِ پاکستان کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب جو قبل از تقسیم دارالعلوم دیوبند کے مفتی رہے (اور جواب مرحوم ہو چکے ہیں) ۔ نے بھی اراضی پاکستان کے بارے میں کچھ اسی قسم کا فتوی دیا تھا۔ ان کے الفاظ میں:-

> سابقہ تفصیل میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی اراضی شرعاً اراضی بیت المال کے حکم میں ہیں۔ جن کا ضابطۂ شرعی یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان ان کی متولی ہے' وہ ان زمینوں کو باشندگانِ ملک میں حسب صوابدید تقسیم بھی کر سکتی ہے اور ان کی ضروریات کے لئے ان میں مساجد' مدارس، رفاہی ادارے خود بھی بنا سکتی ہے' دوسرے مسلمانوں کو بنانے کے لئے دے سکتی ہے۔ شہ

ان تفصیلات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ پاکستان میں کوئی عشری زمین نہیں جس پر عشر نافذ کیا جا سکے۔ یہاں کی تمام اراضی خراجی لہٰذا، اسلامی قانون کے مطابق اسلامی ریاست کی ملکیت ہیں۔ مسلمانوں نے برِصغیر ہند و پاکستان پر جو ایک ہزار سال تک حکومت کی تو اس پورے عرصے میں اسی اسلامی قانون کے مطابق یہاں کی تمام اراضی حکومت کی ملکیت میں رہی۔ اس دور میں کسی غیر حاضر زمیندار کا وجود نہ تھا۔ ان اراضی کے خراج سے جو آمدنی حاصل ہوتی تھی اسی سے حکومت کا انتظام چلایا جاتا۔ کوئی دوسرا ٹیکس عام طور پر نہ لگایا جاتا۔ انگریزوں نے بنگال کے بند و بست دوامی کے ذریعے ملکیت زمین میں تصرف کیا جس سے برصغیر میں غیر حاضر زمینداروں کا طبقہ پیدا ہوا۔ چنانچہ اراضی کی خراج والی آمدنی تو یہ غیر حاضر زمینداروں کا طبقہ سمیٹ لیتا اور ملکی نظام چلانے کے لئے حکومت کو دوسرے ٹیکس لگانے پڑے۔ راقم نے اپنی ایک کتاب "اسلامی ریاست کا مالیاتی نظام" میں اعداد و شمار کے حوالے سے یہ دکھایا ہے کہ آج بھی اگر اسلام کا نظامِ اراضی نافذ کر دیا جائے تو اس سے اتنی آمدنی حاصل ہو سکتی ہے جو موجودہ دور کی کسی بھی جدید حکومت کے اخراجات کے لئے کافی ہے۔ یہ اعداد و شمار پاکستان ائیر بک سنہ ۱۹ء سے لئے گئے تھے۔ اس کے بعد حکومت اس پوزیشن میں ہو گی کہ دوسرے تمام موجودہ ٹیکسوں کو ختم کر سکے۔ اس کے ملک میں خوشگوار نتائج سامنے آئیں گے اور ہمارے عوام تو کیا ساری دنیا کو یہ یقین ہو جائے گا کہ واقعی اسلامی نظام دوسرے نظاموں سے بہتر ہے۔

طلوعِ اسلام

زمین کو خدا کی ملکیت اور اسلامی مملکت کے زیرِ تولیت قرار دینے سے بے شک بہت بڑی اقتصادی اصلاح ہو جائے گی لیکن تنہا اس تبدیلی سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا۔ یہ اس صورت میں حل ہو گا جب موجودہ نظامِ سرمایہ داری کی جگہ پورے کا پورا قرآنی معاشی نظام رائج کر دیا جائے۔ اس نظام میں زمین ہی نہیں۔ فاضلہ دولت بھی کسی فرد کے پاس نہیں رہتی۔ سب حکومت کی تحویل میں چلی جاتی ہے جس سے حکومت، تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔

شہ اسلام کا نظامِ اراضی۔ تالیف مفتی محمد شفیع صاحب مطبوعہ کراچی صفحہ ۴۹)

باسمہ تعالیٰ

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا

○

ہماری تباہی کی داستانِ خونچکاں

یہ اس داستان کا حصہ اوّل ہے جسے پرویز صاحب نے ۱۹۷۵ء کی طلوعِ اسلام کنونشن میں اس عنوان کے ساتھ پیش کیا تھا کہ —— وہ ہمارا خواب تھا' یہ خواب کی تعبیر ہے۔ ۱۹۷۵ء کے بعد اس داستان کا دوسرا حصہ ہوگا لیکن اس کے لئے ہم نے جب بھی اس جگر فگار اور غمگسارِ اُمّتِ مرحومہ سے درخواست کی اس نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ ابھی اس کی ہمت نہیں پڑتی۔

کس قیامت سے شبِ ہجر مری گزری ہے
کہیں میری شبِ ہجراں کی سحر ہو تو کہوں !

سو اُس "سحر" کا ہم بھی انتظار کرتے ہیں' آپ بھی انتظار کریں۔ (طلوعِ اسلام)

○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہماری تباہی کی داستانِ خونچکاں

(حصہ اول ۱۹۷۵ء تک)

(پرویز صاحب ان چند (بقیہِ حیات) محسنوں میں سے ہیں جنہوں نے مطالبہ اور حصولِ پاکستان کی تابندہ آرزؤں کا خواب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا —— اور اس کے بعد انہی آنکھوں سے ان آرزؤں کو پامال ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ اس سے ان کے دل پہ کیا گزر رہی ہے اس کا اندازہ تو وہی لگا سکتے ہیں البتہ انکے اس قلبی درد و کرب کا کسی حد تک اظہار ان کی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ہو جاتا ہے۔ اسی درد سے مجبور ہو کر انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن (سنہ ۱۹۷۵ء) میں .... ایک خطاب پیش کیا تھا جس میں (یوں کہیئے کہ) تحریکِ پاکستان ... اور مملکتِ پاکستان کی ساری تاریخ سمٹ کر آگئی تھی۔ ملت کے سینے کے ان زخموں کو تازہ رکھنے کے لئے ہم اس خطاب کو (بہ تغیر) دوبارہ شائع کرتے ہیں —— یہ سنہ ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ اس میں چار سال کا اضافہ آپ خود ... کر لیجئے)۔

——— (٥) ———

خطاب

ملتِ اسلامیہ کے ایک عظیم مفکر نے جس نے اپنے آپ کو بجا طور پر "دیدۂ بینائے قوم" کہا تھا ایک نہایت حسین خواب دیکھا، جسے اس نے سنہ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر ان الفاظ میں اپنی قوم ہی نہیں، بلکہ ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا کہ

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقے میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں، یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔

اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ (اور یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی) اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے۔۔۔۔۔۔۔۔ اس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔

(خطبۂ صدارت علامہ اقبالؒ۔ مسلم لیگ سیشن ۱۹۳۰ء)

اس اعلان نے فضا میں تھرتھری پیدا کر دی۔ اس وقت تک اسلام کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے۔ اور مذہب کے متعلق تصور یہ تھا کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ روحانی تعلق کا نام ہے۔ امور مملکت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام کے متعلق اس غلط فہمی میں اپنے اور بیگانے، قریب قریب سبھی مبتلا تھے۔ انہوں نے پہلی بار سنا کہ اسلام اسی صورت میں ایک زندہ حقیقت بن سکتا ہے جب اس کے پیروؤں کی اپنی آزاد مملکت ہو، جس میں وہ اس قابل ہوں کہ آزادانہ اسلام کی ابدی اقدار پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اس وقت غیر منقسم ہندوستان میں آزادی کی تحریک جاری تھی جس سے مراد یہ تھی کہ تمام اقتدار انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کر پورے ہندوستان میں ایک آزاد مملکت قائم کر لی جائے۔ اور اس مملکت میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو ——— یعنی اسی قسم کے اسلام کی آزادی، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ آزادی کا یہ تصور عوام ہی کا نہیں تھا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے اکابرین، حتیٰ کہ ان کے علمائے کرام تک اسی کے حامی تھے اور اس آزادی کے حصول کی کوششوں کو جہادِ عظیم کہہ کر پکارتے تھے۔ بنا بریں، مسلمانوں کیلئے آزادی کا جو تصور اقبالؒ نے پیش کیا۔ اس کی، اور تو اور، ان علماء کی طرف سے بھی سخت مخالفت ہوئی اور انہی کے ساتھ علامہ اقبالؒ کو سب سے بڑی جنگ کرنی پڑی۔ اس سلسلہ میں ان کا جو معرکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ ہوا، وہ تاریخ کے صفحات میں ایک ابدی حقیقت کے طور پر منضبط ہے۔ مولانا مدنیؒ کا مسلک یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے بعد وہاں مغربی انداز جمہوریت کی حکومت قائم کر دی جائے، جس میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔ علامہ اقبالؒ کا مؤقف یہ تھا کہ آزادی کا یہ تصور ہندو کا تو ہو سکتا ہے، مسلمانوں کا نہیں۔ جہاں تک ملک کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کا سوال ہے، اس میں مسلمان برابر کے شریک ہیں، لیکن ان کے نزدیک یہ آزادی نہیں بلکہ آزادی کے حصول کا ذریعہ یا اس کی منزلِ اوّل ہے۔ ان کے تصورِ آزادی کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب انہیں اس امر کی آزادی ہو

مسلمانوں کی آزادی

کہ وہ اپنے ہاں اسلامی حکومت قائم کر سکیں ——— اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب بلا شرکتِ غیرے ان کی اپنی جداگانہ مملکت ہو۔ چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے چند ہی ماہ پہلے (۱۹۳۸ء میں) مولانا مدنیؒ مرحوم کے اعتراض کے جواب میں فرمایا تھا:۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزی کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اوّلین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا، چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ویسا ہی رہے، یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں، لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

(علامہ اقبالؒ کا بیان موسوم بہ "معرکۂ دین و وطن")

نیشنلسٹ علماء کا یہ نظریہ بھی تھا کہ ایک وطن کی حدود کے اندر بسنے والے تمام لوگ بلا تفریق مذہب و ملت ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ قوم ہے جس کی مشترکہ حکومت اس ملک میں قائم ہوتی ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ہندوستانی قوم کے اجزاء ہیں اور اس لئے ان کی جداگانہ مملکت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے کہا کہ قومیت کا یہ نظریہ بھی سراسر باطل اور قرآنی نظریۂ قومیت کے خلاف ہے۔ قرآن کی رو سے قومیت کا معیار دین کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا۔ اس لئے کسی ملک کے اندر رہنے والے مسلمان محض اشتراکِ وطن کی بنا پر وہاں کی غیر مسلم آبادی سے مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اس بنا پر بھی اپنی الگ مملکت قائم کرنے کے حقدار ہیں۔ انہوں نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے جواب میں کہا کہ

اسلامی نظریۂ قومیت

اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہؐ کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو، آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول اللہؐ نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظِ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی اتحاد میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔ ...... محمدؐ (فداہ ابی و اُمی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمدؐ کی اُمت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی جو لوگ رسول اللہؐ کی متابعت میں آگئے وہ، خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام کے، وہ سب اُمتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے۔ اب ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا۔ ...... حضورِ رسالتمآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدتِ عربیہ قائم کر لیتے ہیں

سکتی ہے۔ لیکن حضورؐ (نعوذ باللہ) اگر یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ نبی آخر الزماںؐ کی راہ نہ ہوتی۔ (معرکۂ دین و وطن)

علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بھی متعدد بار واضح کر دیا کہ ہم جو کہتے ہیں کہ اسلام میں قومیت کا مدار دین کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا، اور یہ کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اسی صورت میں بن سکتا ہے، جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو، تو کوئی شخص اس زعمِ باطل میں گرفتار نہ رہے کہ ہم ان نظریات کو محض حصولِ اقتدار کے لئے بطورِ حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے دین کی ابدی اور غیر متغیر حقیقتیں ہیں، جنہیں بدقسمتی سے مسلمانوں نے فراموش کر دیا تھا ——— میں انہی کی یاد دہانی کرا رہا ہوں۔ اسی بنا پر انہوں نے فرمایا:

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصوّر کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی۔
>
> (معرکۂ دین و وطن)

یہ تھا وہ خواب، جو اس دیدہ ور نے دیکھا، اور اسے دنیا کے سامنے ایسے واشگاف الفاظ میں پیش کیا۔ اقبالؒ اس حقیقت سے بھی ناآشنا نہیں تھا کہ ایک مفکر صحیح نظریات پیش کر سکتا ہے۔ ان نظریات کو عملی پیکروں میں ڈھالنا سیاسی مدبرین کا کام ہوتا ہے۔ بنا بریں انہیں کسی ایسے مدبر کی تلاش تھی جو اس عظیم مقصد کے حصول کا اہل بھی ہو اور انتہائی قابلِ اعتماد بھی۔ یہ بھی اقبالؒ کے کردار کی عظمت کا ثبوت ہے، ورنہ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ نام نہاد بڑے لوگ، یہ جاننے کے باوجود کہ وہ فلاں کام کے اہل نہیں محض بڑا بننے کی ہوس میں اس کے سامنے بچھے رہنما چاہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کو جو عالمگیر شہرت حاصل تھی اور ملتِ اسلامیہ کے دل میں بالخصوص ان کے لئے جو جذبۂ احترام موجزن تھا، اگر وہ بھی اس قسم کی پوزیشن اختیار کر لیتے تو ان پر کوئی بھی معترض نہ ہوتا۔ لیکن ان کے جذبہ میں صداقت تھی، اس لئے انہوں نے ایسا نہیں کیا، اور کسی ایسی شخصیت کو تلاش کرتے رہے جو اس کی اہل ہو۔ اور بالآخر ان کی یہ تلاش کامیاب ہو گئی۔

جناحؒ کو ڈھونڈ نکالا

دنیائے سیاست کی فراست آج تک محوِ حیرت ہے کہ اس تلاش میں ان کی نگاہ جا کر ٹکی تو کس شخصیت پر ——— اس شخصیت پر جس کے متعلق اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایمان کی بنیادوں پر جداگانہ قومیت اور اسلام کے احیاء کے لئے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے نظریہ کو اپنا سکے گا، اور نہ صرف اپنا سکے گا، بلکہ اُسے کامیابی کی آخری منزل تک بھی پہنچا دے گا۔

بمبئی کے بیرسٹر مسٹر محمد علی جناحؒ بہت بڑے نیشنلسٹ تھے۔ عمر بھر ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار رہے، اور جب اپنی کوششوں میں ناکام رہ گئے تو مایوسی کے عالم میں وطن کو چھوڑ کر سات سمندر پار انگلستان کے ایک گوشۂ تنہائی میں خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ علامہ اقبالؒ کی نگہِ متجسّس جا کر اس شخصیت پر ٹکی ——— چنانچہ انہوں نے مسٹر جناحؒ سے رابطہ قائم کیا اور ایک عرصہ کی جدّ و جہد کے بعد ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو انہیں وہ خط لکھا جو اُن کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اس خط میں

انہوں نے لکھا تھا کہ:-

میں جانتا ہوں کہ آپ بہت بڑے مصروف انسان ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا آپ پر گراں نہیں گزرتا ہوگا۔ (میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہ میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں، جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک پہنچائیں گے۔

(قائدِاعظمؒ کی سوانح عمری - مؤلفہ ہیکٹر بولیتھو - صفحہ ۱۱۵)

یہ تیر اقبالؒ کے قلب سے نکلا اور سیدھا جناحؒ کے دل میں پیر گیا۔ اقبالؒ نے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ قرآنی نظریات کی یہ شمعِ فروزاں جناحؒ کے ہاتھ میں تھا دی جسے ملّت نے بجا طور پر "قائدِاعظمؒ" کہہ کر پکارا۔ اقبالؒ کے بعد دین اور وطن کی یہ جنگ، قائدِاعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے مخالفین کے درمیان ٹھن گئی۔ ان میں انگریز، ہندو، کانگریسی مسلمان، سیاسی لیڈر اور نیشنلسٹ علماء سب شامل تھے۔ اور مسٹر گاندھی اس زمانہ میں اس متحدہ محاذ کا سربراہ تھا۔ مسٹر گاندھی نے قائدِاعظمؒ کو لکھا کہ آپ دین کو قومیت کا معیار کیسے قرار دیتے ہیں اور مذہب کو سیاست میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں۔ اس کے جواب میں قائدِاعظمؒ نے اُسے یکم جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کو ایک خط لکھا جس میں کہا کہ

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست؟ یا عمرانی اصلاح، تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے)۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسان سے واسطہ نہیں، میں اُسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں، اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں، محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے، لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(تقاریرِ جناحؒ - جلد اوّل - صفحہ ۱۳۸-۱۳۹)

جہاں تک دو قومی نظریہ کا تعلق ہے، انہوں نے مسلم لیگ کے مدراس سیشن (سنہ ۱۹۴۱ء) کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:-

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملّی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش

کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا...... ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم نے اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہنا ہے۔ اس باب میں کسی کو، کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۸۰)

مسٹر گاندھی نے انہیں ایک خط میں لکھا کہ

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ، جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے۔ خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

(مکتوب مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء)

اسی قسم کے تھے وہ اعتراضات، جن کے پیش نظر قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء کے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا کہ

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اصلیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں ـــــــ یہ حقیقت ہے کہ دونوں "مذہب" نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے! ہندو اور مسلمان زندگی کے ہر معاملہ میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے ـــــــ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر قائم ہیں۔ دو ایسی قوموں کا ایک نظامِ حکومت میں جکڑ دینا، باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

(تقاریر جناحؒ جلد اول۔ صفحہ ۱۷۸-۱۷۷)

ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ جب علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو انہوں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ اس سے اتنا ہی مقصد نہیں کہ ہمیں ایک خطۂ زمین مل جائے جس میں ہم اپنی آزاد مملکت قائم کر لیں۔ اس سے حقیقی مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی مملکت وجود میں آ جائے، جس میں اسلام پھر وہی زندہ حقیقت بن جائے، جس میں وہ صدرِ اوّل میں بنا تھا۔ قائداعظمؒ بھی، جہاں غیروں کے ساتھ جو مکھی ٹرائی لڑتے تھے، خود اپنی قوم کے دل میں اس حقیقت کو راسخ کئے جاتے تھے کہ اس جدوجہد سے مقصود دنیا کی اور قوموں کی طرح ایک آزاد مملکت قائم کرنا نہیں۔ بلکہ اس سے مقصود اسلام کا احیاء ہے جو اپنی مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ مثلاً انہوں نے ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین، علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان

نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے، بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔

(ایضاً - صفحہ ۲۶۷)

اُن کے نزدیک اس مقصد اور نصب العین کی کس قدر اہمیت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے کہا:۔

ہماری حفاظت، نجات اور عزت و آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو، ہم تو تباہ ہو ہی جائیں گے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس برصغیر میں نہ مسلمانوں کا وجود باقی رہے گا، نہ اسلام کا نام و نشان۔

(تقاریر جناحؒ - جلد دوم - صفحہ ۲۵۵)

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ اُن کے نزدیک مملکتِ پاکستان کا مقصود کیا تھا اور اس کی اہمیت کس قدر۔

فریق مخالف تو ایک طرف، اُن سے خود، ان کے رفقاء بھی رہ رہ کر پوچھتے کہ مسلمانوں میں اس وقت اس قدر اختلافات ہیں۔ یہ انہیں مٹا کر کس طرح ایک اُمتِ واحدہ کے قالب میں ڈھل جائیں گے؟ اس کے جواب میں انہوں نے ۱۳ نومبر ۱۹۴۵ء کو پیغام عید کی نشری تقریر میں فرمایا کہ:۔

جب ہمارے پاس قرآن کریم الیسی مشعل ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکیں گے۔ (تقاریر جناحؒ - جلد اوّل - صفحہ ۱۰۸)

انہوں نے کراچی مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۳ء میں اس اجمال کی تفصیل بڑے بلیغ انداز میں فرمائی۔ انہوں نے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ:۔

وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے...... ؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتابِ عظیم قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسولؐ، فلہٰذا ایک قوم۔

(تقاریر جناحؒ - جلد دوم - صفحہ ۵۰)

اس سے آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ کے نزدیک بھی نہ صرف یہ کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر غیرمسلموں کے مقابلہ میں ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے تھے، بلکہ خود مسلمانوں کے اندر بھی اتحاد ہی نہیں بلکہ وحدت کا بھی یہی ذریعہ تھا۔ اور یہی اسلام کا بھی مقصود ہے۔ انہوں نے ان تمام حقائق کو ایک مقام پر اس حسن و خوبی سے یکجا کر دیا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اُسے مملکتِ پاکستان کے آئین کی بنیاد کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ہوا یہ کہ قائداعظم ۱۹ اگست ۱۹۴۱ء کو حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ وہاں بعض نوجوان طلباء نے ان سے کچھ سوالات کئے۔ اس مکالمہ کو

مسٹر محمود علی، بی اے (عثمانیہ) نے محفوظ کر لیا۔ اورینٹ پریس کی وساطت سے یہ اخبارات میں شائع ہوا اور

اِسلامی مملکت کا امتیازِ خصوصی

طلوعِ اسلام نے اِسے مارچ ۱۹۴۲ء کے پرچہ میں شائع کیا۔ یہ انٹرویو بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس قابل ہے کہ اِسے بار بار سامنے لایا جائے۔ آپ بھی توجہ سے سنیئے :-

سوال :- مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں ؟

جواب :- جب مَیں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سُنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن مَیں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقیّد مفہوم یا تصوّر نہیں ہے۔ میں نہ تو کوئی مولوی ہوں، نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ مَیں نے قرآنِ مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اِس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصّہ ہے، اس سے بہتر تصوّر ناممکن ہے۔

سوال :- اِس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

جواب :- اشتراکیت، بالشویت یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک، راصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال :- ترکی حکومت تو ایک مادی حکومت (سیکولر اسٹیٹ) ہے۔ کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ آپ کا اِس باب میں کیا خیال ہے ؟

جواب :- میرے خیال میں ترکی حکومت پر مادی حکومت کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصوّر کا امتیاز، سو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کے لئے تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

سوال :- وہ مملکت ہمیں ہندوستان میں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے؟
جواب :- مسلم لیگ، اس کی تنظیم، اس کی جدّ و جہد، اس کا رُخ، اس کی راہ، سب اس سوال کے جواب ہیں۔
سوال :- جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصوراتِ زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لاسکیں، تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے؟
جواب :- دِقت یہ ہے کہ جب اس جدّ و جہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے، اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت اور استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں ہیں، ان مولوی صاحبان میں (الاّ ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

آپ اس مکالمہ کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ قائداعظمؒ کے تصور میں اُس پاکستان کا کیا نقشہ تھا، جس کے لئے وہ اِس قدر تن دہی اور جانفشانی سے مصروفِ کار تھے۔ اُسی زمانہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ جب بقول قائداعظمؒ، مولوی صاحبان میں نہ اس کی صلاحیت تھی، نہ اس کی استعداد کہ وہ امورِ مملکت کو سمجھ بھی سکیں تو پھر اُن کے ذہن میں وہ کونسا طریق تھا جس سے وہ اس مملکت کو حقیقی معنوں میں اسلامی بنانا چاہتے تھے۔ اس سوال کا اجمالی جواب تو خود اِس انٹرویو کے ایک ایک فقرہ کے اندر موجود ہے۔ یعنی یہ کہ اس میں قرآن کریم کے احکام ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کریں گے۔ لیکن اس کی تفصیل انہوں نے کئی دیگر مقامات پر بھی بتائی۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں ملّت کے نام، عید کے پیغام میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی :-

اِس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام، مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مورّخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحرِ اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جو نوعِ انسانی کے تمام اعمال و احکام کو محیط ہیں اور جو غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس کے بعد قائداعظمؒ نے کہا :-

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم ؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔

(تقاریر جناحؒ۔ جلد دوم۔ ص ۳)

تھیاکریسی کے خلاف

اس سے واضح ہے کہ قائداعظمؒ کے تصور میں یہی تھا کہ مملکت پاکستان کا بنیادی دستور قرآن کریم ہوگا۔ اور ملتِ پاکستانیہ باہمی مشاورت سے یہ طے کرے گی کہ اس کے اصول و اقدار و احکام کو بحالاتِ موجودہ نافذ کرنے کا کیا طریق ہو۔ اس لئے انہوں نے بار بار اس کی وضاحت کر دی کہ یہاں تھیاکریسی قائم نہیں ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں بحیثیت گورنر جنرل اہل امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا تھا:۔

پاکستان کانسٹی ٹیوشنل اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار، جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اُسی طرح عمل طور پہ منطبق ہو سکتے ہیں، جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئین پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلّم بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی، جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(تقاریر بحیثیتِ گورنر جنرل۔ ص ۶۵)

انہوں نے تحریک پاکستان کے آغاز ہی میں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طلبا کی یونین سے (۱۹۳۸ء میں) خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

مسلم لیگ نے دو بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ ایک، اس نے ہمیں مسلمانوں کے رجعت پسند طبقہ سے آزادی دلا دی ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ اپنی خود غرضیوں کا کھیل کھیل رہے ہیں، وہ غدار ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس نے ہمیں مولوی اور مولاناؤں کے ناخوش آئند عنصر سے نجات دلا دی ہے:

(تقاریر قائداعظمؒ۔ جلد اوّل۔ ص ۴۸)

اور علامہ اقبالؒ نے اس سے پہلے (۱۹۳۲ء میں) اپنے ایک بیان میں جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳؍ مارچ ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، فرمایا تھا:۔

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری ملّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ نظام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدّت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزؤں، نئی تمناؤں، اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگے۔

(بحوالہ پمفلٹ۔ فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ۔ قرآن، صؔ ۲)

انہوں نے ۱۹۲۵ء میں، مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا:۔

آپ نے ٹھیک فرمایا تھا۔ پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتوؤں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا، انشاء اللہ شائع بھی ہو گا۔ مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا ....

ہندوستان میں بالخصوص آج کل بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیئے۔

(انوارِ اقبالؒ۔ صؔ ۳۱)

مشرقی اور مغربی پاکستان

مجوزہ مملکتِ پاکستان کے خلاف عام طور پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا تھا کہ اس میں ایک مملکت دو ایسے حصوں پر مشتمل ہو گی جن میں قریب ایک ہزار میل کا فاصلہ ہو گا۔ ان میں نظم و ضبط اور رابطہ اور واسطہ کا ذریعہ کونسا ہو گا۔ قائدِ اعظمؒ نے ۱۹؍ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے ایک براڈ کاسٹ میں پہلے یہ فرمایا:۔

مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے قریب ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھرے گا وہ یہ ہو گا کہ ایسی مملکت کا قیام کس طرح ممکن ہو گا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہو گی، میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا۔ اور وہ یہ کہ ایسا ہمارے ایمان کی رُو سے ہو گا۔ ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان اپنے مستقبل پر۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں، وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہیں سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل

بھی بیان کر دوں۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا :-

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اُس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساس و روِل کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (ان بنیادوں پر ہم ایک قوم بنتے ہیں)۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۵۸)

آپ نے بعض لوگوں کو جو اپنے دل میں مملکتِ پاکستان اور اس کے معمار، قائداعظم رحہ کے خلاف خبثِ باطن رکھتے ہیں، یہ کہتے سنا ہو گا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران قائداعظم رحہ نے اسلام کا نام محض ایک وکیلانہ حربہ کے طور پر لیا تھا۔ درحقیقت ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گی۔ اُن کے تصور میں اس کا نقشہ ایک سیکولر اسٹیٹ ہی کا تھا۔ آپ سُنیے کہ انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے بعد بحیثیت گورنر جنرل اکتوبر ۱۹۴۷ء میں خالق دینا ہال کراچی میں، حکومتِ پاکستان کے افسروں سے اپنے اوّلیں خطاب میں کیا فرمایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا :-

پاکستان کا قیام، جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے۔ اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے، جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رُوبہ عمل لائے جا سکیں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۲۲)

یہ تھا عزیزانِ من! وہ حسین خواب، جسے ہم نے غیر منقسم ہندوستان کی شبِ تیرہ و تار میں دیکھا تھا۔ خود قائداعظم رحہ نے اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا کہ "پاکستان جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین خوابوں کی تعبیر ہے، پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگیا۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔"

(۰)

خواب کی تعبیر

یہ تھا ہمارا خواب۔ اب اس خواب کی تعبیر دیکھئے۔ مگر دیکھنے کے لئے آپ کو جگر تھام کر بیٹھنے کی ضرورت ہو گی، اس لئے کہ :-

ہم اپنی روداد کیا سنائیں، کچھ اس میں ہیں واقعات ایسے　　اگر کوئی دوسرا سناتا، ہمیں بھی لگتے اسے افسانہ!

پاکستان کا حسین خواب حریر و اطلس کے دو نرم و نازک دھاگوں سے بُنا گیا تھا۔ ایک یہ کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیادوں پر غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں، اور دوسرا یہ کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی جس کا بنیادی دستور خدا کی عظیم کتاب قرآنِ کریم ہوگا۔ اب یہ دیکھئے کہ ہم نے اس تانے بانے کے ساتھ کیا کیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔

مملکتِ پاکستان کی بنیاد اس دینی حقیقت پر تھی کہ غیر مسلم اور مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ قائداعظمؒ تشکیلِ پاکستان کے بعد صرف ایک برس تک زندہ رہے، اور وہ بھی صد ہا قسم کے مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے اور گوناگوں عوارض کا شکار۔ اُن کی وفات کے بعد دنیا یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ گئی کہ خود حکومتِ پاکستان نے اپنی مملکت کے اس بنیادی ستون کو اپنے ہاتھ سے ڈھا دیا۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے اس مملکت کی حدود کے اندر بسنے والے مسلمان اور غیر مسلموں کو اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم تسلیم کر لیا۔ اس سے اس مملکت نے خود اسلام کے ایک بنیادی اصول سے جس طرح انحراف کیا، اُسے تو چھوڑیئے، دیکھئے یہ کہ اس سے اس کی سیاست پر کیا اثر پڑا؟ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی آبادی کم و بیش ڈیڑھ کروڑ تھی۔ وہ ایک خاص منصوبے کے تحت وہیں رہ گئے ...... ہندوستان کی طرف منتقل نہیں ہوئے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ انہوں نے وہاں کے مسلمان بنگالیوں کے ذہن میں یہ خیال ابھارنا شروع کر دیا کہ تمہاری آبادی مغربی پاکستان کی آبادی کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ لہٰذا جمہوریت کی رُو سے مملکتِ پاکستانیہ کی زمامِ اقتدار تمہارے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ اکثریت اور اقلیت کا یہ سوال بجائے خویش نظریۂ پاکستان یا اسلام کے تصور کے خلاف تھا۔ جب (کم از کم) ایک ملک میں رہنے والے تمام مسلمان ایک قوم یعنی اُمتِ واحدہ ہوں تو ان کے اندر اکثریت اور اقلیت کا سوال کیا! یہ تفریق لعنت تو مغربی نظامِ جمہوریت کی پیدا کردہ ہے جس میں قوم سیاسی پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے اور جو پارٹی کسی طرح عددی اکثریت حاصل کر لے، زمامِ اقتدار اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے، اور دوسری پارٹیوں کو اس کا حق دے دیا جاتا ہے کہ وہ اس پارٹی کے خلاف ایجی ٹیشن کرتی رہیں، اور یوں قوم کے انتشار، خلفشار اور فساد کے جراثیم پرورش پاتے رہیں۔ اس مقام پر میں آپ کی توجہ ایک اور دلچسپ حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ انگلستان میں جمہوری نظام رائج ہے وہاں اکثریت اور اقلیت کا سوال ایوانِ پارلیمان کے اندر تک محدود ہے۔ ملک میں مذہب کی بنیادوں پر اکثریت اور اقلیت کا کوئی سوال نہیں۔ وہ سب ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ جمہوری نظام، بھارت میں بھی رائج ہے۔ لیکن وہاں ایک "اکثریت۔ اقلیت" پارلیمان کے اندر ہے، اور دوسری اکثریت۔ اقلیت عام ملک کے اندر۔ یعنی ہندو، اکثریت، اور غیر ہندو، (مسلمان، عیسائی وغیرہ) اقلیتیں۔ ہم نے اپنے ہاں نظامِ جمہوریت بھی رائج کیا تو بھارت کے نمونے کا، جس کی رُو سے، ایک اکثریت اور اقلیت، پارلیمان کے اندر ہے۔ دوسری اکثریت۔ اقلیت، بربنائے مذہب، ملک کے اندر ـــــــ اور پھر ان دونوں پر مشتمل پاکستانی قوم ـــــــ

یعنی اس میں دین کے ایک مسئلہ، اور مطالبۂ پاکستان کی بنیاد سے انحراف تو ایک طرف، خود نظامِ جمہوریت کی بھی نفی ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم سوچنا چھوڑ دے تو اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے!

بہرحال ہمارے ہاں مغربی نظامِ جمہوریت اختیار کر لیا گیا۔ حتیٰ کہ اقامتِ دین کی علمبردار ہونے کی مدعی جماعتوں تک نے اسے اسلامی قرار دے دیا۔ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے پیشِ نظر مقاصد کے لئے یہ نظام بڑا سازگار تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی صرف

مشرقی پاکستان میں ہندو

تعداد ہی اتنی کثیر نہ تھی، وہ وہاں کی مسلمان آبادی کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے دستِ غالب کی حیثیت رکھتے اور زندگی کے ہر شعبہ پر چھائے ہوئے تھے۔ تجارت، سیاست، اقتصادیات، معاشرت حتیٰ کہ تعلیم تک کا ہر گوشہ ان کے زیرِ اثر تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہاں اسلامیات کے مدرس بھی ہندو تھے! نتیجہ اس کا یہ کہ وہ خطۂ زمین، حصہ تو مملکتِ پاکستان کا تھا لیکن حکومت وہاں بھارتی ہندوؤں ہی کی تھی۔ مشرقی پاکستان سے نیچے اتر کر قریب قریب یہی پوزیشن سندھ کی تھی، وہاں بھی ہندو بڑی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔

انگریز کے زمانے میں سارے ہندوستان کا نظام یک حکومتی تھا جس میں اقتدار کا سرچشمہ مرکزی حکومت تھی۔ انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر ملک کو ضلعوں، کمشنریوں اور صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس وقت صوبوں کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ پاکستان میں بدقسمتی سے ایسی فضا پیدا کر دی گئی جس میں مختلف صوبوں نے اپنے آپ کو الگ الگ حکومتیں سمجھنا شروع کر دیا —— حکومتیں ہی نہیں بلکہ الگ الگ قومیتیں —— اس احساس کے آثار بھی اوّلاً مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے شروع ہوئے اور اتنی جلدی کہ وہاں زبان کے اختلاف کی آڑ میں بنگالیوں اور

صوبائی تفریقات

غیر بنگالیوں میں فسادات شروع ہو گئے، اور حالات ایسی نزاکت اختیار کر گئے کہ خود قائدِ اعظمؒ کو وہاں جانا پڑا۔ یہ شروع ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ وہ وہاں قریب نو دن ٹھہرے۔ واپسی پر انہوں نے وہاں کے رہنے والوں کے نام ریڈیو سے ایک الوداعی پیغام نشر کیا جس کے دوران فرمایا:-

> پاکستان، مسلم قومیت کی وحدت کا مظہر ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ ہمیں حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس وحدت کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے۔ اگر ہم نے اپنے آپ کو اوّلاً بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ کی حیثیت سے سمجھنا شروع کر دیا، اور مسلمان اور پاکستانی ہونے کی حیثیت محض اتفاقیہ تصور کر لی گئی تو پھر پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہ کوئی بعید از قیاس اور ناقابلِ فہم سا مسئلہ ہے۔ ہمارے دشمنوں کو اس کے امکان کا اچھی طرح اندازہ ہے، اور انہوں نے ابھی سے اس کے لئے بساط بچھانی شروع کر دی ہے۔ میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔

> ذرا سوچئے کہ جب سیاسی ایجنسیاں اور ہندو پریس، جس نے تشکیلِ پاکستان کی انتہائی مخالفت کی تھی، مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے "مزعومہ منصفانہ حقوق" کا وردِ دل میں لے کر اٹھیں، تو کیا یہ ایک انتہائی شرانگیز چال نہیں ہوگی۔ کیا اس سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے نہیں آجاتی کہ یہ عناصر تخلیقِ پاکستان کی مہم میں ناکام رہ گئے تو اب انہوں نے اس کے اندر انتشار پیدا کر کے اسے ختم کرنے کی ٹھان لی ہے اور اس کے لئے ایسا شرانگیز پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے، جس سے ایک مسلمان بھائی دوسرے بھائی کے خلاف لڑنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

پاکستان دشمن عناصر کی اِن شرانگیزانہ سازشوں کا وجود بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان اِن کا شکار کیوں ہونے لگ گئے؟ اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ ہم ہندوستان سے مسلم قومیت اور پاکستانی آئیڈیالوجی کے نظریات لے کر تو ضرور آئے تھے، لیکن ان کی بنیادوں پر ایک اُمّت نہیں بن پائے تھے۔ نہ ہی ہم نے اس کا احساس کیا تھا کہ یہی ہماری مملکت کے ستون اور ہمارے جداگانہ تشخص اور وجود کی وجۂ جواز ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران نہ اتنا وقت تھا، نہ اتنی فرصت کہ ہم ایسا کر سکتے۔ یہاں آنے کے بعد میں نے اس کا احساس کیا، قرآنِ کریم کی روشنی اور قوموں کی تاریخ کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا علاج، اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے نصاب و نظامِ

تعلیمی انقلاب کا تصوّر

تعلیم کو یکسر بدل دیں تاکہ ہماری آنے والی نسلوں کی ذہنی اور قلبی تربیت اس انداز کی ہو کہ وہ ان نظریات کی حامل قوم بن کر اُبھرے۔ یہاں جو حضرات برسرِاقتدار تھے، اِسے حسنِ اتفاق سمجھئے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران، ہم قافلہ ہونے کی وجہ سے، ان میں سے اکثر کے ساتھ میرے مراسم یا کم از کم تعارف تھا۔ اس لئے ان تک مجھے باریابی حاصل تھی۔ میں نے اُن میں سے ایک ایک پر اس تبدیلی کی اہمیت واضح کی اور اِس مقصد کے لئے بلا مزد و معاوضہ اپنی حقیر سی خدمات بھی پیش کر دیں۔ وہ نظری طور پر اس سے اتفاق کرتے رہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ عملاً اُن میں سے کسی نے بھی کچھ نہ کیا ——— نتیجہ اِس کا یہ کہ ہماری آنے والی نسل، جسے ہمارے دیکھتے دیکھتے ملّتِ پاکستانیہ بن جانا تھا، بے راہروی کی اُسی قدیم فضا میں پرورش پاتی رہی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، مشرقی پاکستان کی نئی نسل کا ملتاً ہندوؤں کی گرفت میں تھی۔ وہاں کا پورا نظامِ تعلیم اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اِس تعلیم نے

اِس تعلیم کے برگ و بار

وہاں کِس قسم کے نوجوان پیدا کئے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک اس خط سے سامنے آجاتی ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم اے فائنل کے طالب العلم عزیز الرحمٰن نے روزنامہ (DAINIC PAKISTAN) کی ۷ رمئی سنہ ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع کیا تھا...... اس خط کا اُردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے:-

سنہ ۱۹۴۷ء میں، تشکیلِ پاکستان کے ساتھ مغربی پاکستان کی طرف سے جو لہر ہماری طرف

آئی تو اس سے ہم نے اپنے بنگالی تشخص کو فراموش کر دیا۔ پنجابیوں، سندھیوں اور بہاریوں کے ساتھ خیالات کی وجہ سے ہم اس قدر بے وقوف بن گئے کہ ہم نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ ہم اوّلاً مسلمان ہیں اور اس کے بعد بنگالی، بہاری، پنجابی وغیرہ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سامراج ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ (جس کے نتیجہ میں پاکستان، بھارت سے علیحدہ ہو گیا تھا) لیکن آج ہمیں قدرے اطمینان کا سانس لینا چاہیئے کہ مختلف اداروں کی کوشش سے خوابیدہ بنگالیوں میں حرکت کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ ہم سری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسےٰ اور (معاذ اللہ) علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے میں فخر محسوس کرنے لگ گئے تھے۔ ہم اپنے بچوں کا نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں لکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ <u>ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا</u> ــــ اللہ ــــ کو اپنا معبود تصور کر لیا تھا۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے تھے اور ناگن کھاگن جیسے سیدھے سادھے ناموں کو تیاگ بیٹھے تھے۔ یہ سب ان رنگین چشموں کا نتیجہ ہے جسے باہر سے درآمد کیا گیا ہے۔ ...... لیکن اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مشرقی بنگال کی اس روش کے نتیجہ میں مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں، اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔ اگر ہم اسی طریق سے اپنے دیگر اہل وطن کے خیالات کو بھی متاثر کرتے رہے کہ وہ جغرافیائی اور لسانی قومیت کو اسلامی قومیت پر ترجیح دیں تو مغرب کی عیسائی قوموں نے ترکوں کی خلافت کو تباہ کر کے جو کچھ حاصل کیا تھا، ہم اس سے بھی زیادہ حاصل کر لیں گے۔

(طلوع اسلام۔ بابت اپریل سنہ ۱۹۷۱ء صفحہ ۱)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مشرقی پاکستان کے بعد مغربی پاکستان میں ہندو مقابلتاً سندھ میں زیادہ اثر رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عزیز الرحمٰن نے یہ کہا تھا کہ بنگالیوں کی طرح یہی جذبات سندھیوں میں بھی بیدار ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں کے ان اثرات، اور غلط نظامِ تعلیم نے سندھ میں کس قسم کی نئی تعلیم یافتہ نسل کو جنم دیا ہے اس کا اندازہ ایک سندھی طالبہ مس تسنیم افضل کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ "حریت" کی اشاعت بابت ۲۸ دسمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس طالبہ نے لکھا تھا:۔

وہ اسلام اور پاکستان، جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور

> پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجو دارو، کوٹ ڈی جان کے آثارِ قدیمہ، اور لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے (نہ کہ اسلام کی وجہ سے)۔
>
> (طلوعِ اسلام ۔ دسمبر ۱۹۶۸ء)

اور آگے بڑھئے۔ مشرقی پاکستان کے ۱۹۷۱ء کے المیہ کے بعد اور اس قیامتِ صغریٰ کے پیشِ نظر جو وہاں کے "بہاری" (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر گزری، سندھ کی ایک ادیبہ — غزالہ بلوچ — کا ایک خط اخبار "ڈیلی نیوز" کراچی کی ۱۹ راگست ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا:۔

> اگر مشرقی پاکستان کے بہاری، پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پُرمسرت حالت میں ہوتے، لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان، ایک پاکستان کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے اور اب اپنی حماقت کی قیمت اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اس دن شروع ہوتی ہے جب انہوں نے ۱۹۴۶-۴۷ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو وہ آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر، ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے، تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا ... ستان میں سندھی بن کر رہیں، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے۔
>
> (طلوعِ اسلام ۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء ۔ صفحہ ۳۳)

یہ تھا اس تعلیم و تربیت کا نتیجہ جو ہماری درسگاہوں میں ہماری نئی نسل کو دی جا رہی تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، میں ان تمام نظائر کو اربابِ حل و عقد کی خدمت میں پیش کرتا رہا۔ ان میں سے بعض حضرات کی کشادہ نگہی مجھے نرم گرم باتیں کرنے کی بھی جرأت دلا دیتی تھی۔ میں اُن سے واشگاف الفاظ میں کہتا کہ آپ پاکستان کی بہبود اور ترقی کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں سب بجا اور درست لیکن آپ یہاں جس قسم کی قوم تیار کر رہے ہیں، اس کے ہاتھوں مجھے خود پاکستان کا وجود خطرہ میں نظر آتا

ہے۔ نہروں، پلوں، سڑکوں، منڈیوں، بینکوں، کارخانوں سے کہیں زیادہ اہمیت ان درسگاہوں کو حاصل ہوتی ہے جن میں نئی قوم زیر تعمیر ہوتی ہے۔ ان درس گاہوں میں جس قسم کی نسل پرورش پا رہی ہے، جب وہ آگے بڑھ کر قوم بن جائے گی تو وہ تباہی مچا دے گی اور یہ ریلیں، سڑکیں، نہریں، سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ لیکن اسے انہوں نے اَن سنی کر دیا، اور قوم اسی نہج پر تیار ہوتی رہی۔ یہ کچھ تو ہماری نئی نسل کے ساتھ ہو رہا تھا ...... جہاں تک ہماری سابقہ نسلوں کے بقیات کا تعلق ہے، جنہیں ہم مسلمانوں کی وہ قوم کہہ سکتے ہیں جو تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان میں موجود تھی، ان کے دل میں مذہب کی عقیدت بڑی پختگی سے پیوست ہے۔ ان کی صورت میں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مذہب کا صحیح تصوّر کیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کا جو تصوّر بنیادی طور پر علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا، اور بعد میں قائد اعظمؒ نے اس کا عام چرچا کیا، اس کی رُو سے اسلام ایک مذہب نہیں، الدّین ہے جس کے احاطہ میں دنیاوی زندگی کا ہر شعبہ آجاتا ہے اور اسی الدّین کو عملاً رائج کرنے کے لئے مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے ہندو نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا۔ اس خطرہ کی روک تھام کے لئے اس نے سوچا یہ تھا کہ مذہب کا ایک ایسا مفہوم پیش کر دیا جائے جو مسلمانوں کے قدیم مذہب پرست طبقہ کے جذبات کی تسکین کا سامان تو فراہم کر دے، لیکن عملاً وہ ایک مفلوج قوم بن کر رہ جائے۔ اس ضمن میں، پنڈت جواہر لال نہرو نے مشہور برہمو سماجی رہنما، شری کیشپ چندر سین، کی صد سالہ برسی کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

> ہندوستان میں اسلام ایک غلط طریق پر آیا۔ بایں ہمہ ان ہر دو متضاد تصورات زندگی، (اسلام اور ہندومت) میں امتزاج پیدا کرنے کے لئے ایک کو دوسرے میں جذب کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ گورونانک اور بھگت کبیر جیسی شخصیتوں اور اکبر جیسے بادشاہ کی کوششوں سے کافی ترقی کر گیا۔ اس کے بعد یہ کوششیں ماند پڑ گئیں لیکن یہ سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ منزل مقصود تک پہنچ جاتا، ایک بیرونی طاقت ہندوستان آ پہنچی۔
>
> (پمفلٹ معرکۂ دین و وطن از پرویز۔ صفحہ ۱۴)

تصوّف بطور سیاسی حربہ

یہ فروری ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ اسی سال ۲۶ رمارچ کو دیوان لال چند نول رائے نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا:-

> تصوّف ہی وہ ذریعہ ہے جس کی رُو سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ تمام اہل ہند قومیت واحدہ کے رشتہ میں پروئے جائیں گے اور یہی چیز ہندوستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے صحیح حل کی طرف راہنمائی کر سکتی ہے۔ (ایضاً)

اسلام کے اس تصوّر (یعنی تصوّف) کے لئے سندھ کی سرزمین بڑی سازگار تھی، کیونکہ وہاں ہندوؤں نے اس سے بہت پہلے اسے ایک تحریک کی شکل دے رکھی تھی۔ آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ سندھ کے بڑے بڑے صوفیاء، فقراء اور سرستوں کے مریدوں میں ہندوؤں کی تعداد بڑی کثیر تھی ——— اور ان کے مزارات اور خانقاہوں کی تولیت میں ان کا اثر غالب تھا۔ معلوم نہیں، اب وہاں کیا کیفیت ہے، لیکن اسلام کا یہی تصوّر ہے جو وہاں کی فضا پر عام طور پر مسلّط ہے۔ اور جی، ایم۔ سید، جو سندھ کی علیحدگی کے جراثیم عام کر رہے ہیں، وہاں اسی اسلام کے احیاء یا فروغ کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ انہوں نے آج سے کچھ عرصہ پہلے سندھی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا اردو ترجمہ "جیسا کہ میں نے دیکھا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اس میں پہلے صحیح اسلام کے بنیادی مسلمات کی مخالفت اور تردید کی، بلکہ ان کا مذاق اڑایا اور اُس کے بعد کہا کہ:-

> صحیح ترین تصوّرِ حیات، تصوّف ہے۔ جس کا اہم اصول وحدتِ مذاہب ہے۔ تصوّف عدمِ تشدد یا اہمسا کا حامی ہے۔ وہ حق و صداقت پر کسی مخصوص گروہ کی اجارہ داری تصوّر نہیں کرتا۔ وہ کسی بھی مذہبی، اقتصادی اور سیاسی نظریہ کو حرفِ آخر جان کر اُس کی اندھی تقلید سے گریز کرتا ہے۔
>
> (صفحہ ۲۰۵۔ بحوالہ پمفلٹ معرکہ دین و وطن۔ صـ۲۲ـ)

مسٹر سیّد نے اس کتاب کے آخری صفحہ پر لکھا ہے:-

> صوفی، مذاہب و عقیدہ کی بنیاد پر قومیت استوار کرنے کے خلاف ہے، اور مذاہب کے موجودہ تعصّبات کو درست نہیں سمجھتا ——— وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا حامی ہے۔
>
> (صفحہ ۲۰۷ بحوالہ پمفلٹ معرکہ دین و وطن۔ صـ۲۲ـ)

تشکیلِ پاکستان کے بعد، پاکستان کے بنیادی نظریات کے خلاف یہ جراثیم سندھ کے خطۂ زمین تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اسے عام کیا اور بڑی شدت سے پھیلایا گیا۔ جن حضرات نے تقسیمِ ہند کا زمانہ دیکھا ہے، انہیں معلوم ہے کہ اس وقت پاکستان میں مرجعِ خلائق، مزارات اور صوفیاء کی درسگاہیں موجود تو تھیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی، اور ان کے سلسلہ میں منائی جانے والی تقاریب اور ان میں شمولیت اختیار کرنے والے زائرین اتنے پُرہجوم نہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد آپ دیکھئے کہ اس اٹھائیس سال کے عرصہ میں یہ سلسلہ کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ اب ملک کی ساری فضا اس سے معمور ہو چکی ہے۔ کوئی جگہ خالی نہیں جہاں ان مزارات کی نمود نہ کر دی گئی ہو، اور سال بھر میں کوئی دن ایسا نہیں آتا جب ان کے سلسلہ میں کوئی نہ کوئی تقریب نہ منائی جاتی ہو ——— عرس، میلے، قوالیاں، مشاعرے، مزارات کے غسل اور چادریں چڑھانے کی تقاریب، نذر و نیاز کی

دیگیں، چڑھاوے۔ قیمتی پتھروں کے فرش، مرصع چھتیں، چاندی اور سونے کے دروازے اور نہ معلوم کیا کیا، جن کا نہ اس سے پہلے کہیں وجود تھا نہ اس قدر نمود۔ —— اب یہ چیزیں یہاں کے عالمگیر مذہب کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت اور بھی قابلِ غور ہے کہ قوم کے نام نہاد ترقی پسند دانشور (یعنی کمیونسٹ) جو خدا اور رسولؐ تک کے منکر اور اسلام کا مضحکہ اڑانے میں ہمیشہ پیش پیش ہوتے ہیں، وہ بھی بڑے ذوق و شوق سے ان تقاریب میں شامل ہوتے اور بڑے جوش و خروش سے ان میں حصہ لیتے ہیں۔

کمیونسٹوں یا سوشلسٹوں کی ٹیکنیک یہ ہے کہ معاشرہ کے نوجوان طبقہ میں فحاشی، بداخلاقی، اور قانون شکنی کے رجحانات عام کرتے جائیں، تاکہ ملک میں ہر طرف خلفشار اور انتشار پھیل جائے۔ دوسری طرف مذہب پرست طبقہ کو ایسے مشاغل میں اُلجھاتے چلے جائیں، جن سے وہ عالمِ کردار سے یکسر بیگانہ ہو جائیں اور دنیاوی یا سیاسی امور میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دیں۔ چونکہ یہ لوگ کسی اخلاقی قدر کے قائل ہی نہیں ہوتے اس لئے وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر حربہ اختیار کر لیتے اور ہر رنگ کا بہروپ بھر لیتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ یہ لوگ خدا اور رسولؐ کے منکر اور ملحد اور دہریہ ہونے کے باوجود "اہل اللہ" کی مجالس میں شریک ہوتے، صوفیاء کی تقاریب میں بھرپور حصہ لیتے، حتیٰ کہ عید میلاد النبیؐ کے سلسلہ میں منعقدہ ..... مشاعروں میں نعتیں تک پڑھتے نظر آئیں گے۔

ان حضرات کی یہی ٹیکنیک ہے جس کی رو سے کیفیت یہ ہے کہ ایک طرف قوم کو مساواتِ محمدیؐ اور اسلامی سوشلزم کا جھنجھنا دیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ :-

> ہم اپنی بقا کی جدّ و جُہد سے آگے بڑھ کر اپنی سربلندی کی جدوجہد کا آغاز کر رہے ہیں، اور یہ آغاز اس لمحہ ہو رہا ہے جب سرزمین ایشیا میں ویت نام اور کمبوڈیا کے مجاہدوں نے وقت کے افق کو اپنے خون کی شعاعوں سے سرخ کر دیا ہے۔
>
> جن ازلی دشمنوں سے ہمیں سابقہ ہے، ان سے نپٹنے کا راستہ روشن ہو چکا ہے۔ یہ پیام دے رہی ہے مجھے بادِ صبح گاہی کہ اگر پاکستان کو جینا ہے، اور سربلند ہو کر جینا ہے تو ایشیا کے افق پر اُبھری ہوئی سرخی سے اپنی مانگ بھرنی ہوگی، اور اس سرخی میں اضافہ کرنے کے لئے اپنے لہو میں نہانا ہوگا۔ آزادی اور انصاف کا یہ سورج تاریخ کی تاریکیوں سے اُبھر تو آیا ہے، اب اسے جتنی جلدی ہم اپنی روحوں میں اتار لیں، اچھا ہے۔ جتنی جلدی پاکستان میں سوشلزم آئے گا، اتنا ہی یہ سورج ہماری زمین سے ہم رشتہ ہوگا۔ اُتنی ہی یہ زمین پھول پھل لائے گی۔

یہ اعلان کسی پرائیویٹ شخصیت نے اپنی نجی محفل میں نہیں کیا تھا۔ پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ محمد حنیف رامے صاحب

نے صوبائی پارلیمان کے اجلاس میں ۷۶-۱۹۷۵ء کا بجٹ پیش کرتے ہوئے بانگِ دہل فرمایا تھا (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور - ۱۵ر جون ۱۹۷۵ء) اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد قوم کو یہ دھمکی بھی دی تھی کہ

> اگر اب اس سوشلزم کا راستہ روکا گیا، جس کے بارے میں ہم اسلام کے حوالے سے بات کرتے ہیں، تو پھر اس ملک میں کمیونزم آجائے گا۔
> (روزنامہ نوائے وقت لاہور - ۱۶ر اگست ۱۹۷۵ء)

بات "اسلام کے حوالے" سے کرتے ہیں، اور ہماری مانگ ...... ایشیا سے نمودار ہونے والے سرخ سویرے سے بھرتے ہیں۔! جہاں تک جمہوریت "ہماری سیاست" کے منشوری دعویٰ کا تعلق ہے، اس کے متعلق کہا گیا کہ:-

> جمہوریت ہماری اصل منزل، سوشلزم کے حصول کے لئے پہلے پڑاؤ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوشلزم کے قائد یہ جانتے ہیں کہ سوشلزم کا انقلاب ہمیشہ دو منزلوں میں آیا کرتا ہے۔ پہلا مرحلہ قومی سطح پر جمہوری انقلاب مکمل کرنا ہوتا ہے اور دوسرا مرحلہ سوشلسٹ انقلاب ہے۔ سوشلسٹ انقلاب کبھی پہلے مرحلہ پر نہیں آتا۔ (ایضاً)

اِس قسم کے خیالات کے عام کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کا نظریہ جو اسلام ہی کے احیاء کا دوسرا نام تھا، دھول بن کر اڑ چکا ہے، اگرچہ قوم کو دھوکہ دینے کے لئے نظریۂ پاکستان اور اسلام کے الفاظ بھی برابر دہرائے جاتے ہیں۔

چار قومیتیں

وجودِ پاکستان کی عمارت کا دوسرا ستون یہ تھا کہ مسلم قومیت کی بنیاد دین کی وحدت ہے، وطن کا اشتراک نہیں۔ اور دین کی وحدت کا اوّلین مفہوم یہ ہے کہ مسلمان مختلف قومیتوں میں نہیں بٹ سکتے۔ اس نظریہ کی بنا پر، اور کچھ نہیں تو کم از کم مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو ایک مستقل قوم قرار دیا جانا ضروری تھا۔ وحدتِ دین کو بھی چھوڑیئے کم از کم وحدتِ وطنیت کی بنا پر بھی یہاں کے باشندوں کو ایک قوم تسلیم کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن یہاں ایک اور سازش کی گئی۔ مشہور روسی مصنف گانکو وسکی نے اپنی تصانیف "تاریخِ پاکستان" اور "پاکستان کے عوام" میں اس تصور کو پیش کیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں متعدد قومیں بستی ہیں۔ اس تصور کو عام کرنے کے لئے ۱۹۶۹ء میں کراچی میں "عوامی ادبی انجمن" کے نام سے ایک تنظیم ظہور میں آئی۔ اس کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا، جس پر منجملہ دیگر "دانشورانِ قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس میں کہا گیا تھا:-

> ہمارے نزدیک اس جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں، جو مختلف قوموں کا وطن ہے، وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں، ان کی زبانیں اور تہذیبیں، کسی ایک قوم کے اثر اور تسلط سے آزاد ہو کر خودمختارانہ

ترقی کر سکیں۔ اس لئے ہم ادیب تمام قوموں کے لئے یکساں داخلی خود مختاری اور ان کی زبانوں کے لئے تعلیم، دفتر اور ملازمتوں کی زبان بننے کا حق چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

(طلوعِ اسلام ۔ مئی ۱۹۷۲ء ۔ صفحہ ۲۲)

ان حضرات کی جرأتیں کس قدر بے باک ہو گئی ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اس سے پہلے قائدِ اعظمؒ کے یومِ پیدائش کی تقریب مختلف تنظیموں کے زیرِ اہتمام منائی جاتی تھی۔ اب دو تین سال ادھر سے خود حکومت کے زیرِ اہتمام قائدِ اعظمؒ کے یومِ پیدائش کی تقریب ہی نہیں۔ پیدائش کا ہفتہ منایا جاتا ہے۔ امسال یہ تقریب ۳، ۴، ۵ جنوری ۱۹۷۵ء کو سیمنار کی شکل میں اسمبلی ہال لاہور میں منائی گئی۔ اس تقریب میں کس کس قسم کے نظریات کی نشر و اشاعت کی گئی، اس کی ایک جھلک فیض صاحب کی اس تقریر سے سامنے آجاتی ہے جو انہوں نے ۴ جنوری ۱۹۷۵ء کے اجلاس میں فرمائی اور جو نوائے وقت لاہور اور پاکستان ٹائمز لاہور کی ۵ جنوری کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے "قومی تشخص کی تلاش" کے موضوع پر (بزعمِ خویش) تحقیق کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے دوران دو قومی نظریہ کا ذکر کیا اور کہا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد اس نظریہ کو خیر باد کہہ دینا چاہیئے۔ اور اس کے بعد فرمایا۔

حصولِ پاکستان کے بعد خود قائدِ اعظمؒ کے سامنے بھی دو قومی نظریہ کا تصور باقی نہیں رہا تھا۔ (کتنی بڑی ہے یہ جسارت!..... طلوعِ اسلام) لیکن کچھ لوگوں نے اپنے مقاصد کے تحت اس نظریہ کو باقی رکھا۔ بہر حال پاکستانی قوم کا تشخص وہی ہے جو قائدِ اعظمؒ نے دیا تھا کہ وہ دھرتی جس کا نام پاکستان ہے، وہاں جو بھی رہتا ہے وہ پاکستانی قوم کا فرد ہے۔ اور یہی دھرتی قومیت ہے۔

یہاں سے کم از کم یہ مترشح ہوتا ہے کہ وطنیت کی بنیادوں ہی پر سہی، فیض صاحب نے مغربی پاکستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم تو تسلیم کر لیا۔ لیکن نہیں! اسی تقریر کے اگلے چند فقرے بھی سن لیجئے۔ فرمایا۔

سرزمین اور فرد کے مرکب کا نام پاکستان ہے۔ اس لئے پہلے تو ہر آدمی کے دل میں اپنے گاؤں اور علاقہ کی محبت پیدا کی جائے۔ لیکن ایک دائرے کے اندر رہ کر ـــــ اور اس دائرے کے اندر تہذیب و ثقافت اور دوسری علاقائی خصوصیات کو اجاگر کیا جائے۔ اس طرح جو چیز ابھرے گی وہ پاکستان ہوگا۔

(طلوعِ اسلام ۔ فروری ۱۹۷۵ء ۔ صفحہ ۶)

آپ نے غور فرمایا کہ مغربی پاکستان میں بھی علاقائی بنیادوں پر مختلف قومیتوں کے تصور کو کس طرح اجاگر کیا جا رہا ہے۔ فیض صاحب اسلام آباد ہی میں فروکش ہیں اور ایسا نظر آتا ہے کہ حکومت کے

ذرائع ابلاغ ——— ریڈیو، ٹی وی‌ژن اور حکومتی زیرِ اثر پریس، ان کی زیرِ ہدایت مختلف قومیتوں کے نظریہ کے عام کرنے میں سرگرم عمل ہے ——— علاقائی زبانوں کا فروغ، لوک گیت، ثقافت کے نام سے علاقائی امتیازات کی عام نمائش، علاقائی میلے ٹھیلے، صوبائی فقیروں کے کلام کی عام نشر و اشاعت۔ اسی نظریہ کے عام کرنے کی مسلسل جد و جہد ہے۔ پریس اس باب میں کیا خدمت انجام دے رہا ہے، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگائیے۔ گزشتہ یوم آزادی کی تقریب پر برسرِ اقتدار پارٹی کے سندھی روزنامہ "ہلالِ پاکستان" نے بھی خاص نمبر نکالا، اس میں ایک طویل مقالہ شائع ہوا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ ایک لادینی ملک چاہتے تھے اور قیام پاکستان کا مطلب نظریاتی مملکت قائم کرنا نہیں بلکہ سیکولر پاکستان تھا۔ اس میں مقالہ نگار نے لکھا کہ:۔

> نظریۂ پاکستان کا نعرہ ملک کے دو حصوں کو جمع نہ رکھ سکتا تھا۔ پھر بھی نظریاتی مملکت کے مطالبات کئے جا رہے ہیں...... نظریۂ پاکستان یا ایک مذہبی مملکت کا نظریہ نہ صرف تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کرتا ہے، بلکہ گھٹیا سوچ بھی پیدا کرتا ہے۔ (بحوالہ ہفت روزہ ایشیا لاہور۔ بابت ۱۷ اگست ۱۹۷۵ء)

مقالہ نگار کا دستِ بے باک، گریبانِ قائداعظمؒ تک بھی جا پہنچا۔ اور اس نے لکھا کہ:۔

> پاکستان میں اسلام ازم والے نظریہ اور نظریاتی ملک کی تردید کتنے ہی مواقع پر قائداعظمؒ نے خود کی تھی...... پاکستان کی جد و جہد جیسے جیسے بڑھتی گئی، ویسے ویسے قائداعظمؒ پاکستان کا صحیح تصور پیش کرنے لگے۔ اور سیکولرازم اور لادینیت پر زور دینے لگے۔ (ایضاً)

آپ غور فرمائیے کہ پاکستان میں بیٹھ کر، بانیٔ پاکستان کے خلاف اس قدر کھلی ہوئی افترا پردازی اور الزام تراشی کی جرأت، کس قسم کی سازشوں کی غماز ہے؟

چلتے چلتے ایک اور بات بھی ذہن میں رکھئے۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ قائداعظمؒ کے یوم پیدائش کی تقریب میں کس قسم کے خیالات پیش کئے جاتے ہیں۔ اب حکومت نے اعلان کیا ہے

جشنِ پیدائش قائداعظمؒ

کہ ۱۹۷۶ء میں قائداعظمؒ کے یوم پیدائش کا صد سالہ جشن منایا جائے گا، اور اس سلسلہ میں تحریک پاکستان کی تاریخ اور بانیٔ پاکستان کے سوانح حیات مرتب و مدون کر کے کتابی شکل میں پیش کئے جائیں گے۔ یہ خدمت بھی فیض احمد فیض اور ان کے اس انداز کے ہم نواؤں کے سپرد کی جا رہی ہے جن کی فکر اور زاویۂ نگاہ کا نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ، آئندہ سال کے مجوزہ جشن کی تقریب پر تحریکِ پاکستان اور حیاتِ قائداعظمؒ کو کس رنگ میں پیش کیا جائے گا۔

ڈھاکہ کے طالب علم عزیز الرحمٰن کے اس خط کو ایک بار پھر سامنے لائیے، جس کا اقتباس پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کے آخر میں اس نے کہا تھا کہ یہی خیالات اب سندھ میں بھی عام ہو رہے ہیں..... سندھ میں یہ سازشیں کس طرح روبہ عمل ہیں، ان کی تفصیلات بہت کم سامنے آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو کچھ سامنے آتا ہے اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ وہاں کی ہواؤں کا رُخ کس سمت کو ہے۔ اس اجمال کی تفاصیل گذشتہ دو تین برس سے طلوعِ اسلام کی مختلف اشاعتوں میں مسلسل پیش کی جارہی ہیں۔ یہاں اُن میں سے صرف ایک مثال کا دُہرا دینا کافی ہوگا۔ وہاں "جیئے سندھ متحدہ محاذ" کے صدر مسٹر جی ایم سیّد نے ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو سندھ یونیورسٹی میں "سندھی شام" کے موقع پر ایک تقریر کی تھی جس میں انہوں نے اپنے تمام نظریات ایک ایک کر کے پیش کئے تھے۔ مثلاً انہوں نے کہا تھا کہ سندھی قوم پرستی کے بنیادی اجزا حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سندھ کے جُداگانہ ملک ہونے میں یقین رکھنا۔

(۲) پاکستان ایک ملک نہیں بلکہ چار جداگانہ ملکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں یقین رکھنا۔

(۳) سندھی، وطن، زبان، کلچر، تاریخی روایات، سیاسی اور اقتصادی مفاد کی بنیادوں پر جداگانہ قوم ہے۔

(۴) سندھی قوم جداگانہ حیثیت میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق انہوں نے کہا کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ "جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو بے وقوف ہیں یا دھوکہ باز"۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ سندھیوں کے پاس برسرِ آنے والی حکومت کی پالیسی کو جانچنے کے لئے کچھ معیار ہونے چاہئیں، جن کے مطابق غلط اور صحیح ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔ میری نظر میں وہ معیار یہ ہیں:۔

(۱) نظریۂ پاکستان میں اعتماد رکھنے والی حکومت سندھیوں کو کبھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

(۲) مضبوط مرکز میں اعتماد رکھنے والی حکومت سندھ کی دشمن ہے۔

(۳) اسلامی آئین یا اسلامی حکومت پر یقین رکھنے والی حکومت سندھ کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔

(۴) سندھیوں کی جداگانہ قوم اور سندھو دیش سے انکار کرنے والی حکومت سندھ دشمن شمار کی جا سکتی ہے۔

(طلوعِ اسلام - جون ۱۹۷۳ء)

یہ ۱۹۶۳ء کی بات تھی۔ حال ہی میں "جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن" کے صدر مسٹر ضمیر لاڑک کا ایک انٹرویو ہفت روزہ "اداکار" لاہور کی ۳۱ اگست تا ۶ ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک سوال کے جواب میں اُس نے کہا:

شیخ مجیب علیحدگی نہیں چاہتا، لیکن اُسے علیحدگی کے لئے مجبور کر دیا گیا۔ اسی طرح اگر ہمیں مجبور کیا گیا تو ہم بھی علیحدہ ہو جائیں گے۔

خطۂ پنجاب کی حالت

یہ ہیں وہ ہوائیں جو مغربی پاکستان میں کئی برسوں سے چل رہی ہیں۔ میں نے بلوچستان اور صوبۂ سرحد کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ ان سطور کی تحریر کے وقت ان صوبوں کے رہنماؤں کے خلاف مقدمہ سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت ہے[1] اس لئے ان کی سرگرمیوں کے متعلق کچھ کہنا قانوناً ممنوع ہے۔ پنجاب کے حالات اور بھی ناگفتہ بہ ہیں۔ یہاں کے پرانے لوگ قدامت پرستی میں متشدد واقع ہوئے اس لئے مذہبی پیشوائیت انہیں فرقہ وارانہ فسادات میں بڑی آسانی سے اُلجھائے اور اپنی مفاد پرستیوں کا آلۂ کار بنائے رکھتی ہے۔ یہاں کوئی دن امن چین سے نہیں گزرتا۔ جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے، اس کا ایک حصّہ "مولانا حضرات" کے پیش کردہ اسلام سے متنفر ہو کر کمیونزم کی آماجگاہ بنتا چلا جا رہا ہے اور دوسرا حصّہ جماعتِ اسلامی کے زیرِ اثر ہے۔ ان طالب علموں کا اسلام کے متعلق ذاتی علم برائے نام ہوتا ہے اس لئے انہیں جو کچھ اسلام کے نام سے سکھا پڑھا دیا جائے، یہ اس کے والہانہ معتقد ہو جاتے ہیں۔

ان کے ذہن میں مودودی صاحب کی شخصیت کو اس قدر پختہ طور پر راسخ کر دیا گیا ہے کہ وہ ان کے ہر قول کو وحیٔ منزل من اللہ کی طرح واجب التسلیم قرار دیتے ہیں ——— مودودی صاحب کو امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا ہم پایہ، مزاج شناسِ رسولؐ حتیٰ کہ اللہ کا شاہکار بنا دیا گیا ہے۔ اُدھر مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا اسلام، ان کی مصلحتوں کے تابع، جسے وہ حکمتِ عملی کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں، ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ انہوں نے ان نوجوانوں کو تعلیم یہ دی ہے کہ جماعت سازی کے سلسلہ میں بڑے بلند آہنگ اور مقدس اصول پیش کرنے چاہئیں، لیکن جب ان پر عمل کرنے کا وقت آئے گا تو انہیں بالائے طاق رکھ کر حکمتِ عملی سے کام لینا چاہئے ——— اور قیامت یہ کہ انہیں بتایا یہ گیا ہے کہ (معاذ اللہ) خود رسول اللہؐ کا بھی یہی مسلک تھا۔

انہیں تعلیم یہ دی گئی ہے کہ زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ ایسے مواقع پر جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہے۔

انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اپنے مخالف کو قتل کرنے کے لئے جھوٹ اور فریب سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ (معاذ اللہ) ایسا خود رسول اللہؐ نے بھی کیا تھا۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ انتخابات میں حصّہ لینا قطعاً ناجائز ہے اور دوسرے وقت میں اسے عین مطابق اسلام بتایا جاتا ہے۔

ایک وقت کہا جاتا ہے کہ عورت سیاسی امور میں قطعاً حصّہ نہیں لے سکتی، اور دوسرے وقت میں مملکت

---

[1] اب بلوچستان کے لیڈر مسٹر میر غلام بخش بزنجو اور سردار مینگل وغیرہ پھر سے چار قوموں کا پھریرا اڑا رہے ہیں۔ (اگست ۱۹۶۹ء)

کے منصب صدارت تک کے لئے عورت کے انتخاب کی پُرزور حمایت کی جاتی ہے۔ ایک وقت کہا جاتا ہے کہ زمین اور دیگر ذرائع پیداوار، یا دولت اور جائداد کی ذاتی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی عائد نہیں کی جاسکتی اور دوسرے وقت میں خود ہی ان کی حد بندی کی تجویز کی جاتی ہے۔ ایک وقت کہا جاتا ہے کہ نیشنلائزیشن بدترین نظام ہے جسے ابلیس ایجاد کرسکتا ہے اور دوسرے وقت میں اس کی خود ہی سفارش کی جاتی ہے۔ ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ مجالس قانون ساز میں پارٹیاں بنانا قطعاً ممنوع ہے اور دوسرے وقت میں اپنے ارکان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ پارلیمان میں اپنی پارٹی قائم کریں۔ ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ امیر جماعت کے مشورہ کا پابند نہیں۔ اُسے مشورہ کے خلاف "ویٹو" کا حق حاصل ہے۔ اور دوسرے وقت میں صدارتی نظام کی اس بناء پر مخالفت کی جاتی ہے کہ اس میں صدر کو "ویٹو" کا حق حاصل ہوتا ہے جو خلاف اسلام ہے۔ ایک وقت میں وکالت کے پیشے کو حرام قرار دیا جاتا ہے اور دوسرے وقت میں وکلاء کو امام ابوحنیفہؒ وغیرہ کے منصب کا وارث ٹھہرایا جاتا ہے۔[1]

یہ ہے نمونہ اس تعلیم کا جو ان سادہ لوح نوجوانوں کو دی جاتی ہے۔ آپ غور سے دیکھیں گے تو آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ اس میں اور کمیونسٹوں کے مسلک میں کوئی بھی فرق نہیں —— فرق ہے تو بس اتنا کہ کسی مسلمان کمیونسٹ کے دل میں ممکن ہے کبھی تنہائی میں یہ خیال اُبھر آئے کہ جھوٹ، فریب اور تضاد کی یہ روش صحیح نہیں ہے۔ لیکن جماعتِ اسلامی کے تربیت دادہ نوجوانوں کے دل میں اس قسم کا خیال کبھی نہیں اُبھر سکتا۔ کیونکہ انہیں اس کا یقین دلا دیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ (معاذ اللہ) خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا ثواب کا موجب۔

ان حالات کے پیشِ نظر آپ غور فرمائیے کہ مستقبل قریب میں اس ملک کا حشر کیا ہونے والا ہے؟ جیسا کہ میں بار بار اعلان کرتا چلا آرہا ہوں، میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ میں نے عملی سیاسیات میں قدم ہی نہیں رکھا۔ میں نے تحریکِ پاکستان کی امکان بھر تائید کی تو اس یقین کی بنیادوں پر کہ اس سے ایک ایسا قطعۂ زمین حاصل ہو جائے گا جس میں قرآنی نظام کے احیاء اور تمکن کا امکان ہو گا۔ یہاں آنے کے بعد میں گزشتہ اٹھائیس سال سے مسلسل یہی پکار دہرائے جا رہا ہوں تو اس لئے کہ یہ میرے ایمان کا تقاضا ہے۔ میرے پاس وہ ساز و سامان نہیں جس سے میں اس دینی تقاضہ کو ملک کا عملی دستور اور نظام بنا دوں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، اس مقصد کے حصول کے لئے، جس کی خاطر یہ مملکت وجود میں لائی گئی تھی، صرف ایک طریق تھا اور وہ یہ کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں کہ قرآنی اقدار کی پابندی ان کی زندگی کا تقاضا بن جائے۔ ہم نے اس سے تغافل برتا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم اس مقام پر آکھڑے ہوئے ہیں جہاں قوم اپنے مستقبل کی طرف سے تا حدِّ مایوس ہو رہی ہے۔ اور مایوسی کا جو نتیجہ ہوا کرتا ہے ظاہر ہے۔ مقامِ تاسف یہ ہے کہ یہ احساس نہ اربابِ سیاست کے ذہنوں میں نظر آتا ہے اور نہ ہی اقامتِ دین کے مدعیوں

---

[1] ان تمام امور کے حوالے طلوعِ اسلام میں پیش کئے جاتے رہتے ہیں۔

کے قلب میں ــــ ان ہی سے ــــ ہر رگ کو ہے تبرّۂ معصوم کی تلاش۔

سرسیدؒ کے زمانے میں بھی قوم، تباہی کے اسی جہنم کے کنارے پہنچ چکی تھی، لیکن جب اس محسنِ ملّت نے یہ سوچا کہ اس کا علاج تعلیم ہے، اور وہ اس تصور کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے اٹھا تو اس دور کی "غلامی" اس کے راستے میں مزاحم نہیں ہوئی۔ لیکن وائے برحالِ ما، کہ ہمارے دورِ آزادی میں اس کا بھی امکان نہیں رہا۔ اسکولوں اور کالجوں کی نیشنلائیزیشن اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی شخص یا ادارہ، صحیح اسلامی تصور کی آزاد درسگاہ قائم کر سکے جس میں محدود پیمانے پر ہی سہی، اس بلند نصب العین کو نوجوانوں کی زندگی کا نصب العین بنایا جا سکے، جسے قرآن نے متعین کیا تھا اور جس کے حصول کے لئے یہ مملکت وجود میں لائی گئی تھی۔ ایک ایسی درسگاہ کے قیام کی میری اسکیم بھی اسی گرداب میں ہچکولے کھا رہی ہے [۱]۔

یہ ہے عزیزانِ من! اس خواب کی تعبیر جسے آج سے پینتالیس سال پہلے حکیم الامت کی نگہ جہاں بیں نے دیکھا اور بانیٔ پاکستان کی فراست نے جہانِ نو کی شکل میں پیش کیا تھا۔ اس خواب اور اس کی تعبیر کی طول و طویل داستان کو اقبالؒ نے ایک مصرعہ میں جس ایجاز و اعجاز سے سمو دیا ہے، یقین مانئے کہ میں جوں جوں اس پر غور کرتا ہوں سوچ کے سمندر میں ڈوب جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اس داستان کے متعلق میں اس سے زیادہ کیا کہوں کہ

خوابم ز یاد رفتہ و تعبیرم آرزو است ــــ میں نے ایک خواب دیکھا تھا جو کبھی کا بھول گیا لیکن میں ہر ایک سے پوچھتا پھرتا ہوں کہ اس کی تعبیر کیا ہے؟ ایک بھولے ہوئے خواب کی تعبیر کی آرزو، یہ ہے ہمارا حاصلِ حیات!

لیکن مجھے، عزیزانِ من! نہ وہ خواب بھولا ہے۔ نہ میں اس کی تعبیر کی طرف سے مایوس ہوں۔ اُمید، نہ تو وقت کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے، نہ ہی اسے پیمانۂ امروز و فردا سے ماپا جاتا ہے۔ یہ تو زندگی کی جوئے رواں کی طرح، جاودان، پیہم رواں، ہر دم جواں رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو دایۂ فطرت نے انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ بند کر دیا ہے، نہ ہی قرآن کی نور افشانیوں کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے اگر آج کا انسان اس قندیلِ آسمانی سے اپنی زندگی کے راستوں کو روشن نہیں کرنا چاہتا تو نہ سہی، کل کو آنے والے انسان اسے دلیلِ راہ بنائیں گے۔ اس کتابِ عظیم کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ کسی دور کا انسان بھی روشنی کی طرف سے مایوس نہ ہونے پائے۔ لہٰذا، جب تک قرآن باقی ہے۔ (اور یہ ابد تک باقی رہے گا) اس وقت تک امید باقی ہے کس قدر حسین اور شگفتہ انداز میں کہہ گیا ہے یہ بات کہنے والا کہ

ازصد سخن پیرم، یک حرف مرا یاد است ــ عالم نشود ویراں، تا میکدہ آباد است

اور یہی وہ حرفِ دلآویز ہے جسے میں بھی دہرائے چلا جا رہا ہوں کہ

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ ــ یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہوگا

قرآن کریم نے ایمان بالآخرت پر جو اس قدر زور دیا ہے تو اس سے مقصد یہی ہے کہ اگر آج کا دور تمہارے مقاصد کے لئے سازگار نہیں تو مایوس نہ ہو۔ اپنی نگاہ مستقبل پر رکھو۔ یہی مستقبل پہ ایمان ہے، عزیزانِ من! جو مجھے کبھی مایوس نہیں ہونے دیتا ــ لہٰذا ــ

نجوم بجھتے رہیں، تیرگی امنڈتی رہے ــ مگر یقینِ سحر ہے جنہیں، اداس نہیں

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۔ (۳/۱۳۸)

والسلام

---

[۱] اس اسکیم کے متعلق تفصیل سے کسی دوسرے وقت بیان کیا جائے گا۔ (طلوعِ اسلام ۱۹۷...ء)

مجرموں کو شرعی سزائیں کیوں نہیں دی جاتیں؟

ملک میں مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شور مچایا جا رہا ہے کہ "حکومت نے بادلِ ناخواستہ شرعی قوانین (یعنی قوانینِ حدود) نافذ تو کر دیئے ہیں لیکن ان کے مطابق مجرموں کو سزائیں نہیں دی جا رہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت بدنیت ہے۔ وہ یہاں اسلام رائج ہی نہیں کرنا چاہتی۔ حکومت کی اس سازش میں پولیس بھی برابر کی شریک ہے اور عدلیہ بھی ملوث"۔ ہم اس موضوع پر مختصر طور پر طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۷۹ء میں لکھ چکے ہیں لیکن چونکہ ان کی طرف سے یہ پراپیگنڈہ بڑی شدومد سے جاری ہے اور غالباً یہ حضرات اپنی انتخابی مہم میں اس نکتے کا سہارا لینا چاہتے ہیں اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان قوانین کا تجزیہ کر کے یہ دکھایا جائے کہ اس کے حقیقی ذمہ دار کون ہیں۔ واضح رہے کہ ہمیں نہ تو پولیس یا عدلیہ کی صفائی مقصود ہے اور نہ ہی ہمارے پاس حکومت کا وکالت نامہ ہے۔ ہمارا مقصد اصل حقیقت کو بے نقاب کر کے یہ بتانا ہے کہ یہ حضرات دوسروں کے خلاف الزام دھرتے ہیں حالانکہ اس کے ذمہ دار یہ خود ہیں اور اپنے پروپیگنڈے سے عوام کو مغالطہ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ مذہب کے نام پر اس قسم کے کھیل آئے دن کھیلے جاتے ہیں۔

یہ قوانین صرف چار جرائم کو محیط ہیں یعنی جرمِ زنا۔ جرمِ قذف (کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا)۔ جرمِ سرقہ (چوری)۔ اور جرمِ شراب نوشی۔ ان کے متعلق حکومت کی طرف سے ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء کو آرڈیننس جاری ہوا تھا۔ ہم اس باب میں جو کچھ لکھیں گے وہ اس آرڈیننس پر مبنی ہوگا لیکن ہم شروع ہی میں واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قانونی سند بہرحال اصل آرڈیننس ہوگا نہ کہ ہماری تشریحات۔ اس کے بعد آیئے موضوعِ زیرِ بحث کی طرف۔

(۱) یہ واضح ہے کہ کسی جرم کی سزا اسی صورت میں دی جا سکتی ہے جب وہ جرم ثابت ہو جائے۔

(۲) اثباتِ جرم کا بنیادی مدار شہادات (گواہوں) پر ہوتا ہے۔ عدلیہ کے نظام میں شہادت کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ضوابط قوانین میں قانونِ شہادت کو سب سے مقدم سمجھا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ زیرِ نظر شرعی حدود کے سلسلے میں شہادت کی کیفیت کیا ہے۔ ان تمام جرائم کے متعلق اصولی طور پر کہا گیا ہے کہ گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ "تزکیۃ الشہود" کی شرائط پر پورا اترے۔ یہ شرائط یہ ہیں کہ وہ صداقت شعار (سچ بولنے والا اور راست باز ہو) اور اس سے گناہِ کبیرہ سرزد نہ ہوئے ہوں۔ اگر کسی مقدمہ میں یہ ظاہر ہو جائے کہ گواہ ان شرائط پر پورا نہیں اترتا تو اس کی گواہی قابلِ اعتماد نہیں سمجھی جائے گی اور مجرم بری ہو جائے گا۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ ہمارے معاشرے میں کتنے فیصد لوگ ایسے نکلیں گے جو ان شرائط پر پورے اتریں؟ اور تو اور، ہم ان پراپیگنڈہ کرنے والے حاملانِ دینِ متین سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ اس کا دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ وہ ان شرائط پر پورے اترتے ہیں؟ ان قوانین کا یہ بنیادی سقم ہے جس کی وجہ سے صدرِ مملکت نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ ان جرائم کے اثبات کے لئے جو شرطیں رکھی گئی ہیں ان کی رو سے شاید فی ہزار ایک مجرم کو بھی سزا نہ مل سکے؟ واضح رہے کہ

ان قوانین میں نہ تو گواہوں کی تعداد کم ہو سکتی ہے اور نہ ہی قرائنی شہادت یا سائنٹیفک پروف قابلِ قبول۔

(۱) جرمِ زنا

جرمِ زنا کے اثبات کے لئے شرائط یہ ہیں کہ

(۱) مجرم خود اقبالِ جرم کرے۔ یا

(۲) چار مسلم، بالغ گواہ جو "تزکیۃ الشہود" کی شرط پر پورا اتریں اس امر کی گواہی دیں کہ انہوں نے زنا کے سلسلہ میں "عمل دخول" کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اگر گواہوں کی تعداد چار سے کم ہو یا شہادت کی جزئیات میں کسی قسم کا اختلاف پایا جائے تو جرم ثابت نہیں ہو سکے گا۔

جہاں تک اقبالِ جرم کا تعلق ہے ہم نہیں سمجھتے کہ ہمارے زمانے میں کوئی بھی ایسا مجرم نکلے جو اقبالِ جرم کر کے سنگسار ہونے یا سو کوڑے کھانے کے لئے اپنے آپ کو انتظامیہ کے حوالے کر دے۔ باقی رہا چار عینی گواہوں کا سوال، سو ہم پوچھتے ہیں اربابِ خرد و ہوش سے کہ کیا ایسا ممکن بھی ہے کہ اس عملِ اختلاط ہی کو نہیں عملِ دخول کو پوری باریک بینی کے ساتھ ایک بھی نہیں، چار اشخاص نے دیکھا ہو۔ حیوانات ہیں تو یہ ہوتا ہے کہ وہ جنسی اختلاط کے عمل میں کسی قسم کا حجاب نہیں رکھتے لیکن انسانوں کی دنیا میں تو یہ حالت ہے کہ ناجائز عملِ اختلاط تو ایک طرف، کوئی شخص اسے بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی اپنی بیوی کے ساتھ اختلاط کی بھنک تک بھی کسی کے کان میں پڑ جائے۔ ان حالات میں فرمایئے کہ اس جرم کی پاداش میں شرعی سزا کس طرح دی جائے؟ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ عدالت کو چاہیئے کہ زنا کے کسی مقدمہ میں وہ ان پراپیگنڈہ کرنے والے مفتیانِ عظام سے کہے کہ وہ چار چشم دید گواہ تلاش کر کے عدالت میں پیش کر دیں۔ اس طرح انہیں ان کے پراپیگنڈے کا جواب خود بخود مل جائے گا۔

(۲) قذف: یعنی کسی کے خلاف زنا کی تہمت لگانا

زنا کی تہمت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ جس شخص کے خلاف تہمت لگائی جا رہی ہے اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ اور زنا کے جرم کے ثبوت کے لئے جو شرائط اوپر بیان کی گئی ہیں ان کی رو سے یہ جرم ثابت ہی نہیں ہو سکے گا۔ اس سے تہمت لگانے والا جھوٹا ثابت ہو گا اور اسے اسی کوڑوں کی سزا ملے گی۔ آپ سوچیئے کہ ان حالات میں کوئی شخص بھی اس کی جرأت کرے گا کہ کسی کے خلاف زنا کی تہمت لگائے خواہ اس کے لئے اس کے پاس قرائن کی کتنی شہادات بھی موجود کیوں نہ ہوں۔ اس کی ایک بیّن مثال پر غور کیجئے۔ کسی شریف عورت کے ساتھ کسی بدمعاش نے زنا بالجبر کا ارتکاب کیا اور اس مظلومہ نے اس ظالم کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ جرم زنا کی شرائط کی رو سے اس ظالم کے خلاف اس جرم کو ثابت نہیں کر سکے گی اور جب وہ اسے ثابت نہیں کر سکے گی تو وہ جرم قذف (جھوٹی تہمت لگانے کے جرم) کی مجرم قرار پا جائے گی جس کی سزا اسی کوڑے ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کوئی عفت مآب خاتون اس ظالم کے خلاف ایک لفظ تک زبان پر لانے کی بھی جرأت نہیں کر سکے گی کیونکہ اس کے خلاف ایسا کہنا بھی تو قذف کے زمرے میں آ جائے گا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ان حضرات کے اس شرعی قانون کی رو سے نہ صرف زنا بالرضا بلکہ زنا بالجبر کے بھی پھاٹک کھل جاتے ہیں۔

(۳) سرقہ (چوری)

جرم سرقہ کے ثبوت کے لئے ضروری ہے کہ

(۱) مال حرز کے اندر سے چرایا گیا ہو۔ حرز سے مراد ہے کوئی مکان یا کوئی الماری یا بکس جو کسی شخص کے قبضہ میں ہو۔ جو مال حرز کے اندر نہ ہو اس کی چوری مستوجب حد نہیں ہو سکتی۔ مثلاً تار یا ٹیلیفون کی تاریں، ریلوے کی پٹریاں، پلیٹ فارموں پر پڑا ہوا مال یا کھلے میدانوں میں رکھا ہوا ساز و سامان وغیرہ۔ اس قسم کے مال کی چوری "حد" کے اندر نہیں آتی۔

(۲) وہ مال مسروقہ نہ ہو۔

(۳) وہ مال چوری (SURREPTITIOUSLY) چرایا گیا ہو۔ اس شرط کا مفہوم کچھ عجیب سا ہے جسے شاید ہم اچھی طرح سمجھ نہیں سکے۔ اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ چور کو اس کا یقین ہو کہ جس کا مال چرایا جا رہا ہے اسے اس سرقہ کا علم نہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر یہ واردات دن کے وقت کی جائے جس میں طلوعِ آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے اور غروبِ آفتاب سے دو گھنٹے بعد تک کا وقت شامل ہے تو واردات کا اس عرصے میں مکمل ہونا ضروری ہے۔

(۴) نصاب ـــــ مال مسروقہ کی قیمت (4.457) گرام سونے کی قیمت کے برابر ہو۔ اگر ایک چور چوری کی بیس وارداتیں کرتا ہے لیکن ہر واردات میں مال مسروقہ کی قیمت نصاب سے کم ہے تو وہ سرقہ کے جرم کا مرتکب قرار نہیں پائے گا خواہ مجموعی طور پر اس مال کی قیمت کتنی ہی نہ ہو۔

(۵) اس کے لئے دو مسلمان چشم دید گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ گواہوں میں وہ شخص شامل نہیں ہوگا جس کا مال چرایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ "چوری" کی واردات کے لئے بھی چشم دید گواہی کی شرط رکھی گئی ہے۔

(۶) اگر مجرم اور مستغیث باہمی رشتہ دار ہوں تو بھی حد کی سزا نہیں دی جا سکے گی مثلاً میاں بیوی (۲) ماں باپ ـــــ اوپر اور نیچے تک (۳) ماں یا باپ کے بھائی بہن یا ان کے بچوں کے بھائی بہن (۴) مہمان (۵) ملازم یا کارندے۔

(۷) اکراہ یا اضطراری حالات میں چوری۔ اکراہ کے معنے یہ ہیں کہ کسی نے اس سے زبردستی واردات کرا دی اور اضطرار کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو بھوک یا پیاس کی وجہ سے موت کا خطرہ لاحق ہو۔

یہ ہیں وہ شرائط جن کے پورا ہونے سے سرقہ کا جرم حد کا مستوجب ہو سکتا ہے آپ غور کیجئے کہ ہمارے ہاں کتنی وارداتیں ہوں گی جن میں اثباتِ جرم کی یہ شرائط پوری ہو سکیں گی؟

(۴) شراب نوشی

اس جرم کے اثبات کے لئے دو مسلمان گواہوں کی ضرورت ہوگی جو تزکیۃ الشہود کی شرائط پوری کریں۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ شرائط جن کے پورا ہونے سے یہ وارداتیں ان جرائم کے زمرے میں آ سکتی ہیں جن کی سزا "شرعی حد" ہے۔ ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں ملک کے ارباب علم و بصیرت سے کہ ان شرائط کی رو سے ایک زندہ کو چھوڑ کر

کوئی واردات بھی ایسی ہو سکتی ہے جس میں جرم ثابت ہو جائے؟ لہٰذا، اگر ان قوانین کی رو سے کسی مجرم کو حد کی سزا نہیں دی گئی تو اس میں پولیس کی کون سی سازش ہے اور عدلیہ کا کون سا قصور؟ یہ غنیمت ہے کہ متعلقہ آرڈی ننس میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اگر جرم حد کی سزا کا مستوجب نہ قرار پا سکتا ہو تو پاکستان کے ضابطۂ فوجداری کے تحت اس کا فیصلہ کر دیا جائے۔ یہ وجہ ہے کہ پولیس اس قسم کی وارداتوں کا چالان بھی ضابطۂ فوجداری کے تحت کرتی ہے اور عدالت اس کی سزا بھی اسی ضابطہ کے مطابق دیتی ہے۔
اگر آرڈی ننس میں یہ گنجائش نہ رکھی جاتی تو کسی مجرم کو کسی قسم کی سزا نہ مل سکتی۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اسے بھی اپنے پراپیگنڈے کا حصہ بنا رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پولیس جان بوجھ کر (بلکہ رشوت لے کر) وارداتوں کا چالان ضابطۂ فوجداری کے تحت کرتی ہے کیونکہ اس سے سزا کم ملتی ہے۔ ان حضرات کا مطالبہ یہ ہے کہ ضابطۂ فوجداری کی متعلقہ دفعات کو منسوخ کر دینا چاہیئے اور جو عدالتیں ان دفعات کے تحت مقدمات کی سماعت کرتی ہیں، ان عدالتوں کو بند کر دینا چاہیئے۔
تجویز نہایت "معقول" ہے! مجرمین کو ضابطۂ فوجداری کے تحت سزائیں مل نہیں سکیں گی اور شرعی حدود کی شرائط پوری نہیں ہو سکیں گی تو ملک میں وارداتوں کے پھاٹک کھل جائیں گے اور مجرم "قانونِ شریعت زندہ باد" کے نعرے بلند کرتے دندناتے پھریں گے۔

اس ضمن میں ہم دل کے پورے سوز و گداز کے ساتھ ایک سوال سامنے لانا چاہتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ قوانین ناممکن العمل بھی ہیں اور بعض جزئیات میں (معاف بفرمائیے) اسلام کے لئے باعثِ تضحیک بھی۔ یہ قوانین فقہ حنفی پر مشتمل ہیں اس لئے اس فقہ کے ماننے والوں کی مجبوری قابلِ فہم ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ فقہی قوانین میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔
لیکن ان قوانین کا مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل میں زیرِ بحث آیا۔ اس کے تمام کے تمام ارکان تو قدامت پرست نہیں۔
پھر یہ وفاقی حکومت کی وزارتِ امورِ مذہبیہ کے بھی زیرِ غور آیا ہوگا۔ وہ وزارت بھی مولانا حضرات پر مشتمل نہیں۔ اس کے بعد یہ وزارتِ قانون میں زیرِ بحث آیا ہوگا۔ وہ وزارت تو بہرحال قانون دان حضرات پر مشتمل ہے۔ پھر یہ کابینہ میں بھی زیرِ غور آیا ہوگا۔ یہ کہنا تو ہمارے نزدیک ان حضرات کی عقل و بصیرت کی توہین ہے کہ وہ اتنا سا فہم و شعور بھی نہیں رکھتے کہ وہ ان قوانین کے اسقام کو سمجھ نہ سکے ہوں۔ اس کے باوجود انہوں نے ایسے قوانین کو کس طرح نافذ کر دیا اس کا جواب وہی حضرات دے سکتے ہیں۔
ان کا جواب کچھ بھی ہو۔ اس سے ہمارے علماء کرام کا حربہ ضرور کامیاب ہو گیا۔ انہوں نے پہلے اس قسم کے ناممکن العمل قوانین نافذ کرا دیئے اور پھر پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ ان پر عمل نہیں کرایا جا رہا۔ اس سے خود تو عوام کی نظروں میں اسلام کے سب سے بڑے مجاہد بن گئے اور انتظامیہ، عدلیہ بلکہ خود حکومت کے متعلق مشہور کر دیا کہ یہ اسلام کو رائج ہی نہیں کرنا چاہتے۔ ان کے پروپیگنڈے کا سیدھا سا جواب یہ تھا کہ یہ قوانین ایسے ہیں ہی نہیں جن پر عمل کیا جا سکے لیکن اربابِ اقتدار یہ جواب بھی نہیں دے سکتے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کہنے سے پبلک کی طرف سے پوچھا جائے گا کہ اگر یہ قوانین ایسے ہی ناممکن العمل تھے تو آپ نے انہیں نافذ کیوں کیا؟
یہ ادنیٰ سی مثال ہے اس تذبذب اور خلفشار کی جس کا شکار وہ ملک ہوتا ہے جس میں مذہبی پیشوائیت کا اثر غالب ہو۔ اس کے بعد اب سوچئے کہ اگر (خدا نکردہ) کہیں اقتدار بلا واسطہ ان لوگوں کے ہاتھ آجائے تو انسانیت کا حشر کیا ہوگا؟ یہ وجہ تھی جو بانیانِ پاکستان (علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ) بار بار اعلان کرتے تھے کہ کچھ بھی ہو، پاکستان میں تھیاکریسی قائم نہیں ہونے دی جائے گی۔ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ —— کاروبارِ ملائی سبیل اللہ فساد —— تو اس کے پیشِ نظر یہی حقیقت تھی۔